OCTOBER
2022
جدید تر ادب کا اشاریہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور

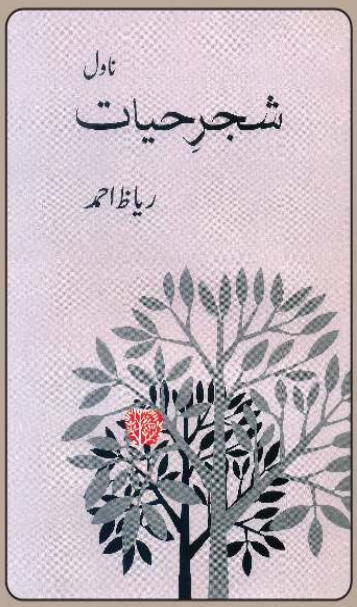
ناول
شجرِ حیات
ریاظ احمد

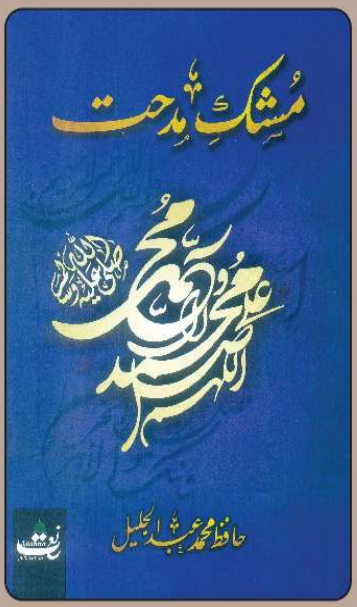
مُشکِ مِدحت
حافظ محمد عبد الجلیل

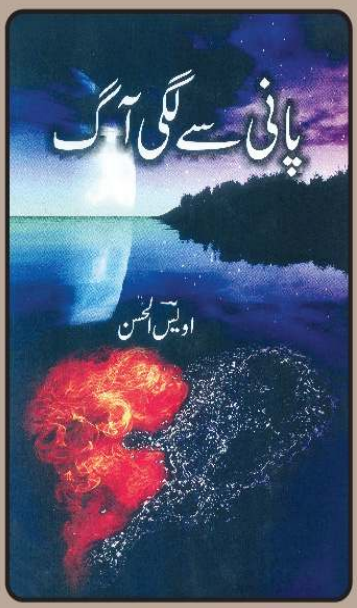
پانی سے لگی آگ
اویس الحسن

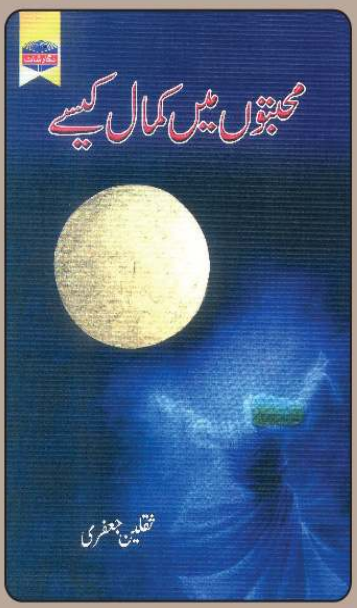
محبتوں میں کمال کیسے
ثقلین جعفری

آدھا سچ

حسنِ جمال جاگتے ہی جانے کیا ہوا

پتھر کی طرح میں ترے آنگن میں آ گرا

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-6
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - اکتوبر 2022 - شمارہ نمبر: 10

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

www.trackntie.com
BAYAZ
ویب سائٹ برائے مطالعہ

عمران منظور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زرعی پیداوار سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	نسیم سحر، خاور اعجاز، محمد یٰسین قمر، خالد علیم، سرور حسین نقشبندی، سید عارف معین بلے، طالب انصاری، تابش کمال، اعجاز وانش، بشیر احمد حبیب، مرزا آصف رسول، عمر قیاز قائل	08 تا 21
3	مضامین	محمد ارشاد، محمد حنیف، محمد ظہیر بدر، ظفر معین بلے جعفری، آصف ثاقب، فرح نادر، فیصل زمان چشتی، خالق آرزو	22 تا 83
4	شاعرِ امروز	حارث بلال، حسین فرید (شاہد ماکلی)	84 تا 88
5	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	89 تا 97
6	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، رشید آفرین، نسیم سحر، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری، منظور ثاقب، راحت سرحدی، طالب انصاری، اقبال مروبہ، یعقوب پرواز، مسعود احمد، اکرم جاذب، حریم حیدر، جسارت خیالی، شوکت محمود شوکت، ہمایوں پرویز شاہد، رضا اللہ حیدر، شکیل جاذب، سید فرخ رضا ترمذی، تسنیم کوثر، قیوم طاہر، سعد اللہ شاہ، واجد امیر	98 تا 163

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
6	غزلیں	افتخار شاہد، شاہد ماکلی، علی رضا احمد، اشرف کمال، افتخار شوکت محمد سلیم ساگر، فیض رسول فیضان، ارشد محمود ارشد، علی عارف اکرم ناصر، فرح شاہد، علمدار حسین، ارسلان ساحل، امجد بابر اسد اعوان، راجہ عبدالقیوم، عامر عباس ناصر اعوان عاطف جاوید عاطف، نائلہ راٹھور، صغیر احمد صغیر، احمد محسود سرفراز تبسم، کیفی قلندر، امر مہکی، علی رضا بلوچ، عتیق احمد محمود کیفی، میثم محسن، جیا قریشی، ریحانہ شبیر زخار، مہر علی رخسانہ سحر، عمر قیاز قائل، رانا محمد شاہد، امتیاز انجم، گل گلشن	98 تا 163
7	طنزومزاح	ناصر محمود ملک	164 تا 166
8	افسانے	ابدال بیلا، سیما پیروز، فصیحہ آصف خان، نور کمال شاہ محمد افتخار شفیع	167 تا 217
9	مائیکروفکشن	نادیہ عنبر لودھی	218 تا 219
10	نظمیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، سلطان سکون گلزار بخاری، عقیل رحمانی، حامد یزدانی، رخشندہ نوید عاطف جاوید عاطف، امجد بابر، نائلہ راٹھور، اعجاز دانش رخسانہ سحر، عدیل عباس عادل، اعجاز رضوی	220 تا 235
11	خطوط	نسیم سحر، طالب انصاری، فرخندہ شمیم، اشرف کمال فیض رسول فیضان، رانا محمد شاہد	236 تا 241

حمد

لفظوں کو توقیر خدا ہی دیتا ہے
لہجوں میں تاثیر خدا ہی دیتا ہے

پہلے اچھے خواب دکھا کر آنکھوں کو
پھر ان کو تعبیر خدا ہی دیتا ہے

ہم تو اپنی ذات میں الجھے رہتے ہیں
ہر اچھی تدبیر خدا ہی دیتا ہے

اپنی یاد عطا کر کے خوش بختوں کو
اشکوں کی جاگیر خدا ہی دیتا ہے

کھلتا ہے یہ راز بھی قسمت والوں پر
ہر لکھی تقدیر خدا ہی دیتا ہے

بس اتنی سی بات بٹھا لو ذہنوں میں
جذبوں کو تنویر خدا ہی دیتا ہے

سرور اس کی قدرت کوئی کیا سمجھے
قطرے کو تصویر خدا ہی دیتا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

دیکھا ہے کبھی پیکرِ اوصافِ حمیدہ؟
ہیں میرے نبیؐ پیکرِ اوصافِ حمیدہ !

ثابت انہیں کرتی ہے بہرگام ہی اُنؐ کی
عالی نسبی، پیکرِ اوصافِ حمیدہ

مجموعۂ اوصافِ حمیدہ تھے یقیناً
کہلائے جبھی پیکرِ اوصافِ حمیدہ

ہم ہی نے نہیں، اُنؐ کو تو ٹھیرایا ہے واللہ
اللہ نے بھی پیکرِ اوصافِ حمیدہ

خالق نے کہی نعت ہی قرآن کی صورت !
در مدحِ نبیؐ ، پیکرِ اوصافِ حمیدہ

اپنے ہوں کہ اغیار ہوں، سچ یہ ہے کہ اُنؐ کو
کہتے ہیں سبھی پیکرِ اوصافِ حمیدہ

اوصاف تو تھے دوسرے نبیوں میں بھی بے شک
پر میرے نبیؐ پیکرِ اوصافِ حمیدہ!

ہر عہد سے ملتی ہے نسیم اِس کی شہادت
اُمی لقبی، پیکرِ اوصافِ حمیدہ

نسیمِ سحر

نعتؐ

گزرے ہے ہر اک گل مرے گلزار سے ہو کر
آتا ہوں مَیں جب روضۂ سرکارؐ سے ہو کر

جس ضو سے منوّر ہے سیہ خانۂ ہستی
آتی ہے وہ اُنؐ کے رُخِ انوار سے ہو کر

کیوں کھینچتا ہے شہرِ مدینہ، کھُلا اُس پر
گزرا ہے جو اُن کوچہ و بازار سے ہو کر

کِھلتے ہیں جہاں پھُول، مہکتی ہیں ہَوائیں
آتی ہے صبا بھی اُسی گلزار سے ہو کر

مَیں مسجدِ نبویؐ میں کھڑا سوچ رہا ہوں
جانا نہیں اَب اِن در و دیوار سے ہو کر

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کی نکہت رنگ سے قریہ قریہ گل آثار
کس کے چراغ کی لو سے جھلمل جھلمل طاق بہار

نعتیہ نظم

جب اماوس کے رتجگوں میں
اداس لمحے
مہیب سوچیں، بڑی عجیب وغریب سوچیں
دیارِ جاں کا حصار کر کے
مرے مقدر کو گھیرتی ہیں
مرے تصور کو چھیڑتی ہیں
حریمِ جاں میں صدا یہ آئے
حرم کے راہی! ثنا کے خوگر! درود خواں ہو
یہ ظلمتِ شب، اداس راہیں، یہ وسوسوں کے
بسیط صحرا، یہ شیطنت کے حصار سارے
تمہارا رستہ نہ روک پائیں گے
اے ثنا گر! حرم کے راہی! درود خوگر
خدا تمہارا، نبیؐ تمہارا
نظر اُٹھاؤ
وہ سبز گنبد کا نور ہالہ
تمہیں محبت سے اپنی جانب بلا رہا ہے

محمد یٰسین قمر

قصیدۂ نعت

کہاں جہاد؟ کہ جہد و عمل ہے مثلِ مجوس(۱)
نہیں کہ اُتریں گے پھر سے فرشتگاں کے جلوس

جوابِ کفر میں عبداللہ بن رواحہؓ کا
قلم تھا نطق فشاں، سینہ برتر از قاموس

سرودِ سعی و عمل ہی سرورِ مومن ہے
یہی نشاط، اسی میں نجات کا ہے فلوس(۲)

عطا ہوئی کسے بُردہ کی دولتِ عظمیٰ
درونِ خواب ملا کس کو خلعتِ ملبوس

خیال و فکر میں الفاظ کی حقیقت کیا!
کہ اُس کی مدح میں کم تر ہے حیطۂ قاموس

قصیدہ خوانِ رسولؐ اُمم، وہ بوصیری
کھلی جب آنکھ تو رخصت ہوا غمِ منحوس(۴)

درونِ کہف وہ سب کس کے انتظار میں تھے
سمجھ سکا نہ یہ نکتہ وہ شاہِ دقیانوس(۳)

یہ شاہ نامہ ہے دفترِ فسوں طرازی کا
مقدّم و مترنّم سہی یہ نغمۂ طوس(۵)

سخن ورانِ پیمبرؐ کا مرتبہ ہے کچھ اور
کہ حاصل اِن کو ہے فردوس کا مقامِ عروس

کسے عطا ہوا ''صلوا علیہ'' کا اِنعام
درخت سبز کے نیچے بہ زیرِ شاخِ سَدوس(۶)

وہ شہریارِ ثنا، وہ حضورؐ کا حسانؓ
نبیؐ کا آبرومند اور نعت کی ناموس

عظیم رتبہ ملا جامی و گرامی کو
کہ تھی انھیں درِ احمدؐ کی حسرتِ پابوس

۱- مجوس: آتش پرست۔

۲- فلوس: مال و زر۔

۳- دقیانوس: سلطنتِ روم کا گورنر جس کے شر سے بچنے کے لیے اصحاب کہف غار میں چھپ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُن پر تین سو سال کی نیند غالب کر دی۔

۴- غمِ منحوس: (علامتی معنویت) عربی شاعر بوصیری رحمہ اللہ علیہ کو برص (پھلبہری) کا مرض لاحق تھا۔ خواب میں چادرِ رحمت عطا ہوئی اور آنکھ کھلنے پر یہ مرض بھی جاتا رہا۔

۵- طوس: شاہنامہ کے خالق فردوسی طوسی کا وطن۔

۶- سَدوس: سبز رنگ کی چادر۔

ولائے احمدؐ مرسل ہے میرے سینے میں
مگر تسلسلِ انفاس میں ہے نامحسوس

وہ غم گسارِ غریباں، پناہِ مظلوماں
وہ پاسبانِ حمیت، وہ حافظِ ناموس

ڈھلی جو حُبِ رسولِ عظیم رگ رگ میں
رواں لہو میں ہے ہر ایک جزءِ محبوس

اُسی کے فیض سے ظلمت گہِ جہالت میں
نظر فروز ہیں فہم و شعور کے فانوس

یہی ہے زمزمۂ زمزمِ بقائے حیات
یہی بہشت کا نغمہ، یہی ہے نغمۂ سُوس[۷]

جو میں ہوں وحیِ خفی کے جمال سے آگاہ
سو معتبر ہے کہاں مجھ کو نامۂ قابوس[۱۱]

سیاہ خانۂ دنیا میں مدحِ پاک کے ساتھ
جھلک رہے ہیں نگاہوں میں چاندنی کے عکوس

بشر کو آگہی توحید کی ودیعت کی
کہ جس سے سرد ہوئے شعلہ ہائے نارِ مجوس[۱۲]

گریز اے قلمِ خوش رقم گریز کہ اب
صریرِ مدح شنیدم بہ وقتِ بانگِ خروس[۸]

سرِ جمیلؔ پہ رحمت ہے ربِّ اعلیٰ کی
تہِ قدم رہا جاہ و جلالِ کی کاؤس[۱۳]

سرودِ نعت ہو سرمایۂ سخن میرا
سو ایک مطلع ہو تشبیبِ تام[۹] کا معکوس

نہ کیوں ہو فخر اُسے بوریا نشینی پر
کہ فرشِ خاک تھا تخت اُس کا رشکِ صد طاؤس[۱۴]

بہ فیضِ نکہتِ محبوبؐ خالقِ قدوس
ہے عطر بیز مرا غنچۂ دلِ مایوس

کہاں یہ جرأتِ بے جا، مقابل اُس کے ہو جَم
مجال کیا؟ کرے اُس کی برابری کاؤس[۱۵]

وہ ماہتابِ مدینہ، وہ آفتابِ حجاز
ہیں جس کے سامنے بے نور صد ہزار شموس[۱۰]

ہر ایک طرّۂ کسرائی سرنگوں ٹھہرا
ہر ایک پرچم دارائی ہو گیا منکوس[۱۶]

۷۔ سوس: دشتِ سوس، منصور حلاج کی طرف اشارہ ہے۔
۸۔ بانگ خروس: صبح صادق کے وقت مرغ کی اذان۔
۹۔ تام: کُل، مکمل۔
۱۰۔ شموس: شمس کی جمع، سورج۔
۱۱۔ نامۂ قابوس: یونان کے مشہور فاتح سکندر کے بیٹے (کیکاؤس بن سکندر) کی پند و نصائح پر مشتمل کتاب "قابوس نامہ"۔
۱۲۔ مجوس: آتش پرست۔
۱۳۔ کیکاؤس: سکندر یونانی۔
۱۴۔ طاؤس: ہندوستان کے مغل بادشاہ کا تخت۔
۱۵۔ کاؤس: قدیم ایران کا ایک بادشاہ۔
۱۶۔ منکوس: اوندھا، الٹا۔

نبیؐ کی رحمت و رافت کا یہ کرشمہ ہے
نبیؐ کے ادنیٰ غلاموں سے خوار و خستہ ہوئے

کھلا دہانِ عجم میں حصارِ ترکی و روس
مجالِ دم زدنی میں بڑے بڑے دیوس[۲۱]

جہادِ حق میں جو نکلے غلام اُن کے تمام
حقیر تر تھے غلامانِ مصطفیٰؐ کے لیے

نکل گیا رگِ گیتی سے کفر کا کابوس[۱۷]
جہان کے متکبر شہنشہوں کے جلوس

حکیمِ دل بھی، طبیبِ بدن بھی ہے ایسا
اُٹھایا کفر نے سر جس جگہ، پھر آخرِ کار

کہ ہر علیل پہ ہے اُس کی رحمتوں کا عجوس[۱۸]
انھیؐ کے زیرِ نگیں تھی وہ دولتِ محروس[۲۲]

شفا وہ دست و لعابِ دہن میں ہے اُس کے
میں اُس کے اسوۂ احسن سے فیض یاب رہوں

کہ اس کے علم کو ہے ہیچ حکمتِ کیموس[۱۹]
عمل ہو میرا خلافِ ترقیِ معکوس

شجر، حجر، فلک و ارض پر نظر ایسی
یہی دُعا ہے، یہی حرزِ جاں بھی مجھ کو رہے

کہ جس کے سامنے کم تر ہزار بطلیموس[۲۰]
کہ ٹوٹ جائے فسونِ برہمن و ناقوس[۲۳]

سما گئی ہے مرے عالمِ تخیل میں
رہیں نہ اَور فلسطین و کاشمیر مرے

وہ اُس کے نقشِ کفِ پا کی لذتِ ممسوس
گرفتِ دستِ یہود و ہنود میں محبوس

زہے نصیب کہ اصحابؓ نے سُنے پیہم
کرم! عطائے کرم میرے سیّدِ سادات!

وہ مسجدِ نبویؐ میں محبتوں کے دُروس
نہ فتح مند ہوں دشمن کے سر پھرے جاسوس

۱۷- کابوس: ایک ایسی بیماری جس سے مریض رات کو نیند کے وقت اپنے سینے پر دباؤ محسوس کرتا ہے اور پھر ڈر کر جاگ اُٹھتا ہے۔
۱۸- عجوس: بادل۔
۱۹- کیموس: کیمسٹری کا معرّب۔
۲۰- بطلیموس: دوسری صدی عیسوی کا مشہور یونانی ماہرِ فلکیات۔
۲۱- دیوس: بدترین، جو شخص غیرت مند نہیں ہوتا وہ ''دیوث'' (دیوس) ہے۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے گھر میں بدکاری فحاشی اور غلط روش کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق فرمانِ نبوی ہے کہ لَا یَدخُلُ الجَنَّۃَ یعنی وہ جنت میں نہیں جا سکے گا۔
۲۲- دولتِ محروس: وہ سلطنت جو زیرِ نگیں ہو۔
۲۳- ناقوس: وہ سنکھ جو ہندو یا دوسرے غیر مسلم یا مشرک پوجا کے وقت بجاتے ہیں۔

خالد علیم

نعتؐ

قرار جاں وہ اسم دلربا تقسیم کرتا ہے
سکون دل در خیر الوری تقسیم کرتا ہے

وہاں کا سبز موسم پھر نہ کیوں رشک بہاراں ہو
جہاں کا دشت بھی سایہ گھنا تقسیم کرتا ہے

گھٹائیں ان کے آنگن کی ہوا ترتیب دیتی ہے
اجالا ان کے حجرے کا دیا تقسیم کرتا ہے

وہ سیرت بانٹتی ہے آگہی کی روشنی ہر سو
وہ لہجہ خوشبوؤں کا سلسلہ تقسیم کرتا ہے

زمانہ سیر ہوتا ہے انہی کے فقر و فاقہ سے
یہ مال و زر انہی کا بوریا تقسیم کرتا ہے

مسیحائی کا اک اعجاز ہے خاک قدم ان کی
لعاب پاک بھی ان کا شفا تقسیم کرتا ہے

سبھی مسند کو ٹھکرا دیں اگر یہ راز کھل جائے
زمانے کی شہی ان کا گدا تقسیم کرتا ہے

غنی سارے اسی چشم غنا کی بھیک پاتے ہیں
سخی ہر ایک ان کا ہی دیا تقسیم کرتا ہے

میں کشکول سخن لے کر ادب سے بیٹھ جاتا ہوں
وہ جن لمحات میں رزق ثنا تقسیم کرتا ہے

انہی کے در سے ملتا ہے شعور بندگی سرور
خدا کا راستہ وہ نقش پا تقسیم کرتا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

دے دیجے مجھے روشنی، خیرات نبیؐ جی
کچھ سوچ کے پھیلائے ہیں یہ ہات نبیؐ جی

رحمت کی گھٹا برسے تو جی اُٹھوں گا میں بھی
دھرتی کا بدن خشک ہے، برسات نبیؐ جی

مل جائے جو موسم کو بھی ہلکا سا اشارہ
پت جھڑ میں بھی ہو جائیں ہرے پات نبیؐ جی

چاہیں تو اماوس میں نکل آئے گا سورج
پھر دن میں بدل جائے گی یہ رات نبیؐ جی

مل جائے گی اس دھوپ کے صحرا میں مجھے چھاؤں
رکھ دیجیے بس سر پہ مرے ہات نبیؐ جی

کرنوں میں پرونے ہیں مجھے شبنمی موتی
للہ کرم، چشمِ عنایات نبیؐ جی

جو مانگا ملا ہے، جو نہیں مانگا عطا ہو
پوشیدہ ہیں کب آپ سے حاجات نبیؐ جی

اِک جھونپڑا طیبہ کی کسی کچی گلی میں
کب مانگے ہیں جنّت میں محلّات نبیؐ جی

چُپ ہے، درِ رحمت پہ گنہگار کھڑا ہے
نادم ہے کرے کوئی بھی کیا بات نبیؐ جی

سر بارِ ندامت سے مرا اُٹھ نہیں پایا
ہے دید سے محروم ملاقات نبیؐ جی

بہتے ہوئے آنسو بھی دُعا مانگ رہے ہیں
قابو میں نہیں ہیں مرے جذبات نبیؐ جی

کرنوں میں پرونے ہیں مجھے شبنمی موتی
للہ کرم، چشمِ عنایات نبیؐ جی

دروازۂ لب کھولئے، کچھ بولئے، سُن لوں
قرآن سے قرآن کی آیات نبیؐ جی

مجھ کو ہی نہیں، عزتِ سادات بچا لیں
خطرے میں ہے اب عزتِ سادات، نبیؐ جی

بس اتنی دُعا ہے کہ کسی کو نہ خدا دے
شبیر کے غم کے سوا صدمات نبیؐ جی

اب ہاتھ نہیں، مانگو دُعا جھولی اُٹھا کر
لو، دیکھو ہیں مائل بہ عنایات نبیؐ جی

یہ مجھ سے گنہگار پہ ہے آپؐ کی رحمت
میں نعت کہوں، ؟ کیا مری اوقات نبی جی

سید عارف معین بلے

نعتؐ

تیرا احساں ہوا ، میں مدینے میں ہوں
شکر ہے یا خدا ، میں مدینے میں ہوں

پہلے تقدیر سے تھی شکایت مجھے
اب نہیں کچھ گلہ ، میں مدینے میں ہوں

سر پہ موجود ہے رحمتوں کی گھٹا
غم نہیں دھوپ کا ، میں مدینے میں ہوں

ساتھ تیرا مرا بس یہیں تک کا تھا
زندگی اب تو جا ، میں مدینے میں ہوں

مجھ سے کج رو کو بھی منزلیں مل گئیں
یہ کرم ہو گیا ، میں مدینے میں ہوں

اور اس کے سوا کچھ نہ درکار تھا
مل گیا منتہیٰ ، میں مدینے میں ہوں

دنیا والو مجھے اب صدائیں نہ دو
تم سے کہہ تو دیا ، میں مدینے میں ہوں

طالب انصاری

نعتؐ

غموں کی دھوپ میں دامن کرم کا تھام لیتے ہیں
زباں دھوتے ہیں زم زم سے پھر اُنؐ کا نام لیتے ہیں

زمانے سے نہیں پاتے صلہ اپنی محبت کا
ہمیشہ بارگاہِ خیر سے انعام لیتے ہیں

درودِ پاک و مدحِ مرسلیںؐ اپنا حوالہ ہے
یونہی پیغام دیتے ہیں، یونہی پیغام لیتے ہیں

درِ اقدسؐ پہ ہر کوئی رسائی پا نہیں سکتا
یہ وہ برکت نہیں جو سارے خاص و عام لیتے ہیں

ہمیں نعتِ نبیؐ کی سرخوشی مسرور رکھتی ہے
نگاہِ ساقیٔ کوثر سے بھر بھر جام لیتے ہیں

بوقتِ نعت گوئی لفظ عاجز ہوں جہاں تابش
وہاں ہم بھیگی پلکوں، آنسوؤں سے کام لیتے ہیں

تابش کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ زَمن تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

نعتؐ

بھٹکتے پھرتے ہو کیوں ابتلا کے رستے میں
سکوں ملے گا رسول خدا کے رستے میں

حضورؐ آپ کی جن پر ہوئی ہے چشم کرم
وہ دیپ لے کے چلے ہیں ہوا کے رستے میں

مجھے درود کی پرواز کی خبر ہو جائے
جو سوچوں آپ کو عرش علا کے رستے میں

گلاب کھلنے لگے کاغذوں کے دامن پر
قلم ہے نعت حبیب خدا کے رستے میں

مدینے پاک کی گلیاں ہوں اور میں دانش
تمام عمر کٹے مصطفیٰ کے رستے میں

اعجاز دانش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منہ دیکھتے ہی رہ گئے جادو بیاں سبھی
لب گنگ ہو کے رہ گئے معجز سخن تمام

نعتؐ

وقت سے بھی ماورا ہیں آپ ہی
زندگی سے رابطہ ہیں آپ ہی

حسن کا اک معجزہ ہیں آپ تو
ہر طرف جلوہ نما ہیں آپ ہی

ابتدا ہر کام کی ہے آپ سے
ہر سفر کی انتہا ہیں آپ ہی

زندگی ہو گی مکمل آپ سے
ہر دعا کا مدعا ہیں آپ ہی

آپ مجھ سے پاس بھی ہیں دور بھی
آپ منزل، فاصلہ ہیں آپ ہی

فکر میں پھیلے اندھیروں کے لیے
نور کا اک سلسلہ ہیں آپ ہی

میرا ہر غم بھی جڑا ہے آپ سے
اور ہر دکھ کی دوا ہیں آپ ہی

دو جہانوں کے لیے اب تو حبیب
میں جو مانگوں، مدعا ہیں آپ ہی

بشیر احمد حبیب

نعتؐ

محمدؐ ہے سید، سند ہے محمدؐ
کہ محبوبِ ربِ صمد ہے محمدؐ

محمدؐ کے رتبے تعدد سے بالا
مگر حاصلِ ہر عدد ہے محمدؐ

اُدھر حسنِ لاہوت ازل سے احد ہے
اِدھر عشق ابد تک، احد ہے محمدؐ

چنے عشق کے پھول حسنِ ازل نے
اور ان میں گُلِ سرسَبد ہے محمدؐ

رہیں گے رہینِ اس کی چشمِ کرم کے
دل و جاں میں حُبِّ اشد ہے محمدؐ

نہ کیوں شد و مد سے ہو نعرہ: رسالت
کہ جانے دلِ شد و مد ہے محمدؐ

ہے رب دینے والا تو سب لینے والے
مگر بابِ داد و سَند ہے محمدؐ

وہ جس کے فروغِ مکارم کے صدقے
بڑھا آدمیت کا قد، ہے محمدؐ

تری اے رخِ زندگی! جس کی ضو سے
منور ہوئے خال و خد، ہے محمدؐ

ابھی تول لو اپنے اعمال نامے
کہ میزانِ عقل و خرد ہے محمدؐ

وہیں تک ہے مُلکِ اِباحت کی وسعت
جہاں اِس قلمرو کی حد ہے محمدؐ

شریعت ہے اک معنوی جسم گویا
دلِ جسم و جانِ جسد ہے محمدؐ

رہیں کیوں نہ منصور اسلام و ایماں
زہے نصرتِ حق مدد ہے محمدؐ

وہ لا اُقسِمُ امِ القریٰ پہ ہے نازاں
کہ حِلٌّ بِھٰذَا البَلَد ہے محمدؐ

کوئی عہدِ ظلمت نہیں اب کہ آصف!
۵۷۱ء "سراجِ منیرِ ابد" ہے محمدؐ

مرزا آصف رسول

نعتؐ

سبز پُرنُور مناروں کی طلب رہتی ہے
میری کشتی کو کناروں کی طلب رہتی ہے

آپؐ کا جب سے میسر ہے سہارا مُجھ کو
کب مجھے اور سہاروں کی طلب رہتی ہے

آپؐ کے لُطف و کرم ہی سے مرے گلشن کو
زرد موسم میں بہاروں کی طلب رہتی ہے

جو چمک خاکِ مدینہ میں ہے دیکھی ہم نے
آنکھ کو ایسے ستاروں کی طلب رہتی ہے

آپؐ بے مثل مسیحائے جہاں ہیں آقاؐ
آپؐ کو رنج کے ماروں کی طلب رہتی ہے

شہرِ بطحا میں اُڑوں بن کے میں خوشبو قائل
دِل کو پُرنُور بہاروں کی طلب رہتی ہے

عمر قیاز قائل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں
نعت خود لکھی ، بہ پیرایۂ سیرت لکھی

یادِ ایامے کہ

زخیلِ دُرد کشانِ کہن نہ ماند کسے
بیار بادہ کہ ماہم غنیمت ایم بسے

.....

بیاض (جولائی، اگست) کے دوشماروں میں ''معتبر شاعرہ منصورہ احمد کی متنازعہ شخصیت'' کے زیرِعنوان مضمون نے کئی بسرتی باتیں تازہ کر دیں - 'فنون' سے میرا تعلق 1980 سے قائم ہوا- ان دنوں میں منصورہ احمد کا کلام اور مکاتیب بھی 'فنون' میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے- بعد میں وہ شریک مدیرہ بھی بن گئیں- ندیم صاحب کے سے عظیم مربّی کی معیت، مصاحبت اور تربیت نے اس جوہر قابل میں مزید نکھار پیدا کر دیا تھا- دفتر 'فنون' ندیم صاحب کی وجہ سے ایک اکیڈمی کی صورت اختیار کر چکا تھا جہاں آنے والے جواہر قابل حسب توفیق وہ کچھ سیکھ لیتے تھے، جو بصورت دیگر ممکن نہ تھا-

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورِ بوم خس

.....

کئی فیض یاب ہوئے اور کئی فیض سے محروم- عبداللہ قریشی، رشید ملک، اختر حسین جعفری، سید محمد کاظم، مشکور حسین یاد کے سے اجلہ اہل قلم اور نوجوانوں میں خالد احمد، نجیب احمد اور اعجاز رضوی کے سے اُبھرتے ہوئے شاعروں میں سے بعض بلاناغہ اور بعض گاہ گاہ حاضر رہتے تھے- آج سوائے اعجاز رضوی کے ان میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں- دفتر 'فنون' بھی بوجوہ بلاک F-2 واپڈا ٹاؤن منتقل ہو چکا ہے- اس کہکشاں کے ستارے ایک ایک کر کے اپنے مہِ کامل ندیم کے ساتھ غروب ہو چکے ہیں- لاہور میرے لیے انہی کے دم سے لاہور تھا- لاہور جانا آنا اب بھی ہوتا ہے - اب لاہور میں میرے لیے پُرکشش جگہیں دو ہی ہیں، پودوں کی نرسریاں اور کتابوں کی دکانیں-

منصورہ احمد کو ندیم صاحب نے منہ بولی بیٹی بنا رکھا تھا- یہ بہت بڑا اعزاز تھا، جو پروین

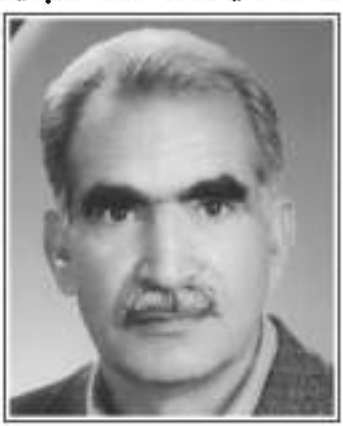

محمد ارشاد

شاکر کے ساتھ منصورہ احمد کی قسمت میں بھی تھا۔ منصورہ احمد نے بیٹی بننے کی حق دار اپنے آپ کو ثابت بھی کیا۔ عمر کے آخری چند سالوں میں ندیم صاحب اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ صحت، جواب دے رہی تھی ہر چند ہمت میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔ دمہ کے علاوہ اور بھی کئی عوارض جو عمر کا تقاضا تھے لاحق تھے۔ انہی آخری سالوں میں سے کسی سال میں نے ان کی صحت کے بارے میں فون کیا، تو فون منصورہ نے اُٹھایا اور بتایا کہ بابا اس وقت ہسپتال میں داخل ہیں اور وہ ان کے پاس موجود۔ دمہ کی شکایت ہے۔ آپ خود بات کرلیں۔ میں نے کہا ان کی طبیعت کا پوچھنا تھا آپ نے بتا دیا تو انھیں تکلیف نہ دیں۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ انھیں قائم اور خوش وخرم رکھے۔ کہنے لگیں آپ ان لوگوں میں سے ہیں، جن سے بات کر کے بابا کو خوشی ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر فون ندیم صاحب کو تھما دیا۔ حال پوچھنے پر بتایا: اللہ کا شکر ہے۔ اس عمر میں جیسا ہونا چاہیے اس لحاظ سے تو بہت بہتر ہوں۔

ندیم صاحب ہمہ جہت صاحب قلم ہی نہیں، بہت بڑے آدمی بھی تھے، صدق وخلوص کا پیکر۔ اپنے دور کے سب سے بڑے ادبی فیض رساں۔ مجھ ایسے کئی ایسے ویسوں کو انھوں نے ہی اہلِ علم وادب میں متعارف کروایا۔ مجھے پڑھنے سے دلچسپی رہی ہے قلم کار بننے سے کبھی نہیں رہی۔ اس میدان میں آنا ایک ''حادثہ'' کا نتیجہ تھا۔ فلسفہ طلبہ کے لیے پُرکشش مضمون کبھی نہیں رہا۔ بہت کم طلبہ یہ مضمون لیتے ہیں۔ بی اے میں دو لڑکوں نے یہ مضمون لے رکھا تھا۔ ایک دن میں نے ان میں ایک کے ہاتھ میں سید علی جلالپوری کی ''عام فکری مغالطے'' دیکھی۔ دونوں نے پڑھ رکھی تھی۔ میں نے ان سے یہ کتاب لے لی اور گھر جا کر ساری پڑھ ڈالی۔ دوسرے دن کتاب واپس کرتے ہوئے دونوں سے کہا کہ اس کے مباحث پر اپنا اپنا تبصرہ لکھ کر لائیں تاکہ مجھے بھی پتہ چلے کہ تم دونوں میں فلسفہ فہمی کس سطح کی ہے۔ چند دن بعد دونوں لکھ لائے۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ انھوں نے کیا لکھا اور اسے پڑھ کر میں نے کیا کہا یہ ضرور یاد ہے کہ دونوں نے کہا کہ آپ خود کچھ لکھیں۔ میں نے لکھ دیا۔ ایک نے جو 'فنون' کا مستقل قاری تھا اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اسے 'فنون' میں اشاعت کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔ سو اس نے ایسا ہی کیا۔ کچھ مدت بعد یہ تبصرہ 1980-1981 میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔ آخری قسط میں میں نے کتاب کی جائز تعریف بھی کی تھی۔ اس آخری قسط والے شمارے میں علی عباس جلالپوری کا جواب بھی چھپا جو پہلی دو قسطوں کا تھا۔ تیسری قسط میں اپنی تعریف جو کتاب کی اہمیت کے بارے میں تھی، پڑھ کر علی عباس جلالپوری نے ندیم صاحب کو خط میں لکھا کہ

''ارشاد صاحب نے جس قدر شناسی کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر ان سے مباحثہ بے ذوقی ہوگا۔'' یوں یہ مباحثہ ختم ہو گیا۔ ندیم صاحب نے بھی اشارۃً یہ کہہ دیا کہ اسے جاری نہ رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے پابند بھی کر دیا کہ 'فنون' کے لیے لکھنا ترک نہ کروں۔ اس کے بعد جو بھی لکھا ان کی اسی خواہش کی تعمیل تھا۔ چونکہ خالد احمد کو ندیم صاحب سے اور 'بیاض' کو 'فنون' سے کبھی الگ نہیں جانا اس لیے 'بیاض' میں بھی گاہ گاہے شریک ہو جاتا ہوں۔ ورنہ حلقۂ ادبا میں شمولیت کی مجھے کبھی دلچسپی رہی ہے نہ خواہش ہی۔ ایک قلبی تعلق دونوں سے تھا اور اب بھی ہے، جسے قائم رکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔ منصورہ احمد چونکہ ندیم صاحب کی منہ بولی بیٹی 'فنون' کی شریک مدیرہ بھی تھیں اس وجہ سے میرے لیے قابل احترام بھی۔ ماہتاب ادب ندیم سے جس کسی نے بھی تابانی حاصل کی میرے لیے قابل احترام ہے۔ منصورہ احمد نے 'مونتاج' نکالنے کا ارادہ کیا تو مجھے بھی قلمی تعاون کا کہا۔ نہ میں نے وجہ پوچھی نہ منصورہ نے وجہ بتائی کہ کیوں 'فنون' کے ہوتے ہوئے وہ اپنا رسالہ نکال رہی ہیں۔ بہرحال 'مونتاج' کا پہلا شمارہ چھپا تو وہ احمد ندیم قاسمی نمبر تھا۔ یہ ایک حق تھا جو اس نے حسب توفیق ادا کر دیا۔ یہ نمبر عام اخباری کاغذ پر چھپا تھا اور بعد کے رسالے بھی اسی کاغذ پر چھپتے رہے۔ حالانکہ بحیثیت شریک مدیرہ کے 'فنون' بھی سفید کاغذ پر چھپنے لگا تھا جو قبل ازاں اخباری کاغذ پر چھپتا تھا۔ مالی مشکلات ہر علمی و ادبی رسالے کی راہ میں حائل رہی ہیں۔ 'مونتاج' کی راہ میں بھی حائل رہیں۔ اس کے باوصف منصورہ احمد نے ہمت نہیں ہاری اور 'مونتاج' کا ہر شمارہ بروقت نکالا - 'مونتاج' کے کل گیارہ شمارے ہی شائع ہوئے کہ منصورہ احمد بھی اُدھر کو چل دیں جدھر کو ہر آنے والے کو جانا پڑتا ہے۔ منصورہ کے چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو جانے کا علم مجھے سید محمد کاظم کے خط سے ہوا:

C-133 فیک سوسائٹی

نیو کیمپ_ لاہور

30 جون 2011

مکرمی جناب محمد ارشاد صاحب

السلام علیکم!

امید ہے مزاج بخیر ہوگا اور گھر میں ہر طرح سے عافیت ہوگی۔ عزیزہ منصورہ احمد یکا یک ہمیں چھوڑ کے چلی گئیں۔ پچھلے دنوں پتا لگا کہ وہ 'مونتاج' کا نیا شمارہ 12 جلدی لانے کی فکر میں ہیں۔ ظفر پال ان کے ہاں گئے تو کہنے لگیں کہ اگلا مضمون مجھے جلدی چاہیے اس لیے کہ نیا شمارہ کچھ ہی دنوں میں لا رہی ہوں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ عرصے سے ان کا بلڈ پریشر شوٹ کرنے لگ گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ نڈھال ہو

جایا کرتی تھیں۔ انھی حالات میں وہ ایک رات سوئیں تو پھر اُٹھ نہ سکیں۔ غالباً رات کو کسی وقت دل کا ایسا حملہ ہوا کہ اس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ 'انا للہ وانا الیہ راجعون!' ان کی وفات کی خبر جب مجھے ملی تو اس وقت تک وہ حافظ آباد کے کسی قبرستان میں مدفون ہو چکی تھیں۔ عزیزہ کے یوں چلے جانے سے بے حد افسوس ہوا اور ایک اور افسوس اس بات کا ہوا کہ اردو ادب کی اتنی بڑی اور مقبول شاعرہ اور جناب احمد ندیم قاسمی کی منہ بولی بیٹی کی وفات کی خبر نہ کسی اخبار نے دی نہ ٹی وی پر کسی نے اس کا ذکر کیا۔ کچھ دن گزرنے پر البتہ بعض لوگوں (امجد اسلام امجد، بشریٰ اعجاز، زاہدہ حنا) نے اپنے اپنے اخبار میں اس کے بارے میں کالم لکھے۔

جناب ندیم قاسمی کے جانے کے بعد 'فنون' کی محفل اُجڑ گئی۔ خود 'فنون' بھی کچھ عرصے کے لیے کتم عدم میں چلا گیا۔ عزیزہ منصورہ احمد تنہا رہ گئیں۔ تاہم اپنی ہمت اور قابلیت سے 'فنون' کا بدل 'مونتاج' کے نام سے نکالا جس کے کچھ شمارے 'فنون' ہی کے معیار کے تھے۔ لیکن پھر گرتی ہوئی صحت اور عام کمزوری کی وجہ سے بعد کے کچھ شماروں میں طباعت کا وہ معیار قائم نہ رہ سکا۔ منصورہ اس دوران میں کافی بیمار رہیں۔ ان پر فالج کا ہلکا سا حملہ بھی ہوا اور شوگر اور بلڈ پریشر نے ان کو الگ عذاب میں مبتلا رکھا۔

'مونتاج' کے پچھلے دو تین شماروں سے البتہ لگتا تھا کہ وہ بہت حد تک ٹھیک ہو گئی ہیں۔ رسالے کا معیار بھی بہتر ہو گیا۔ اس میں پروف ریڈنگ اور کاپی جوڑنے کی غلطیاں بھی کچھ کم ہو گئیں۔ اور وہ ہر طرح سے 'مونتاج' کو باقاعدگی سے نکالنے پر کمربستہ تھیں۔ لیکن زندگی کی جتنی مہلت وہ لے کر آئی تھیں وہ ختم ہو گئی اور ان کے سب منصوبے دھرے رہ گئے۔ ان کا ایک بڑا منصوبہ اپنی شاعری کے دوسرے مجموعے 'آسمان میرا ہے' کی اشاعت تھی۔ یہ مجموعہ انھوں نے ہر طرح سے تیار کر لیا تھا لیکن اس پر ایک مقدمہ ضرور لکھوانا چاہتی تھیں۔ اس کے لیے انھوں نے شاہد نواز زیدی سے کہا لیکن انھوں نے مسودہ کچھ عرصہ اپنے پاس رکھ کر واپس کر دیا کہ یہ مقدمہ میں نہیں لکھ سکتا۔ اب انھوں نے مقدمے کے لیے کسی اور سے کہا ہوا تھا، نہ جانے کس سے؟_ مقدمہ لکھوانے کے اس شوق فضول میں کتاب کی اشاعت رہ گئی۔ اور شاعرہ اپنا دوسرا مجموعۂ کلام چھپا ہوا دیکھنے سے پہلے ہی چلی گئیں۔ اب خدا جانے اسے کون شائع کرے گا اور شاعری کے ایسے عمدہ مجموعے کو اب کبھی دن کی روشنی دیکھنا بھی ہو گی یا نہیں!

آج آپ سے دکھ کی یہ باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے آپ سے ایک گزارش کرنی ہے اور وہ یہ کہ آپ نے اب تک رسالہ 'فنون' میں جو کچھ

لکھا ہے وہ کیفیت اور کمیت کی اعتبار سے کوئی شک نہیں بہت وقیع ہے۔ اسے آپ ازراہ کرم جمع کر دیں اور دیکھیں اس مواد سے کتنے مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں ایک مجموعہ تو مثلاً 'رباعی کی تاریخ' کا ہوگا جو ایک بڑی (ہر لحاظ سے بڑی) کتاب ہوگی۔ اسی طرح دو یا تین یا چار دوسرے مجموعے بھی ترتیب دیے جا سکتے ہیں، جن میں سے ایک مجموعہ متفرق مضامین (مثلاً جھوٹ نگری کی سیر) کا بھی ہو سکتا ہے ___ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہاں لاہور میں ایک ادارہ ہے اِلقا پبلی کیشنز، جن کی انگریزی کتابوں کی ایک اعلیٰ پائے کی دکان Readings کے نام سے گلبرگ بولیوارڈ پر ہے۔ ان لوگوں نے حال ہی میں 'فنون' میں شائع ہونے والے میرے تبصروں اور جائزوں کا مجموعہ 'کل کی بات' کے عنوان سے چھاپا ہے۔ یہ لوگ جن میں مشہور ادیب اور مترجم محمد سلیم الرحمان پیش پیش ہیں، آپ کی تحریروں سے واقف ہیں اور ان کے بارے میں بہت اونچی رائے رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے کچھ دن ہوئے میرے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ آپ کی کتابیں شائع کرنا چاہیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس بارے میں آپ سے بات کروں اور آپ کو اپنی کتابیں شائع کرانے پر آمادہ کروں ___ اب میں آپ سے اس سلسلے میں گزارش ہی کر سکتا ہوں۔ آپ سے کوئی بات منوانے کا تو میرا خیال ہے مجھے حق نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ ہمارے درمیان تکلف کی ایک صورت بہرحال موجود ہے۔ پھر میری نظر میں آپ کا علمی مرتبہ اتنا اونچا ہے کہ میں آپ کے ساتھ تعلق کی ایک حد میں ہی رہ سکتا ہوں، اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ میری اس گزارش کو قابل اعتنا سمجھیں اور اپنی تحریروں کے جتنے بھی مجموعے مرتب کر سکتے ہیں، انھیں مرتب کر دیں اور القا پبلی کیشنز کو ان کی اشاعت کی اجازت دے دیں۔

اگر آپ ان کی شائع کردہ میری کتاب 'کل کی بات' دیکھنا چاہیں تو میں اسے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ اس سے آپ کو ان لوگوں کے کام کے معیار کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

عزیزی منصورہ احمد تو اپنا آخری کلام چھپا ہوا دیکھنے سے پہلے ہی چل دیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ کو بھی اپنی کوئی چیز چھپی ہوئی دیکھنے کا موقع نہ ملے۔ آپ ماشاء اللہ صحت مند ہیں اور ایک عمر آپ کے سامنے پڑی ہے۔ میری یہ دلی تمنا ہے کہ آپ اپنا (منیر نیازی کے الفاظ میں) کل کلام اپنی زندگی میں چھپا ہوا دیکھیں اور یہ جان کر خرسند ہوں کہ علم کے۔ متلاشی اسے پڑھ کر اس سے کس طرح مستفید ہو رہے ہیں۔

میں اب پچاسی برس کا ہونے لگا ہوں۔ بڑھاپا دھیرے دھیرے جسم میں سرایت کر

رہا ہے۔ وہ پہلے والی توانائی نہیں رہی۔ حافظہ بھی کافی حد تک جواب دے چکا ہے۔ دو اڑھائی سال ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کا سلیس اور رواں اردو میں ترجمہ کیا تھا لیکن میرے ناشر (سنگ میل نے اس کی اشاعت میں بہت دیر لگا دی۔ اب ستمبر اکتوبر میں کہیں اس کے آنے کی امید ہے۔ خدا کرے وہ میری زندگی میں چھپ کر آجائے تاکہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں میں اسے تقسیم کرسکوں۔

اوپر جو میں نے گزارش کی ہے امید ہے آپ اسے اپنے ایک بزرگ بھائی کی درخواست سمجھ کر قبول کرلیں گے اور بغیر کسی کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنے مجموعے مرتب کرکے اشاعت کے لیے دے دیں گے۔ آپ اپنے بارے میں جو کچھ سمجھتے ہیں سمجھتے رہیں لیکن ہم جو کچھ آپ کے بارے میں جانتے ہیں اسے بے وقعت سمجھتے ہوئے رد تو نہ کریں۔ ہم اپنی سمجھ بوجھ میں اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔

میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

والسلام

آپ کا مخلص
محمد کاظم

.....

افسوس کہ سید محمد کاظم بھی نہ رہے۔ کُلُّ مَن علیھا فان۔ نہیں معلوم میری باری کب آئے۔ محمد کاظم انجینئر تھے لیکن عربی زبان و ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ 'فنون' میں ابوالعلا معری، بشار بن برد اور خوان الصفا پر پایے کے مضامین لکھے اور قرآن کریم کا واقعی سادہ و سلیس اور رواں اردو میں ترجمہ کیا اور مجھے بھی بھیجا۔ اس کے علاوہ اپنی دو کتابیں 'یادیں اور باتیں' اور 'کل کی بات' بھی عنایت کیں۔ میں نے ان کی خواہش کی تعمیل میں 'فنون' میں رباعی کے بارے میں اپنے مضامین مرتب کرکے انھی کو بھجوائے اور انھوں نے جناب محمد سلیم الرحمان کو۔ کتاب کو دیکھ کر کام کا معیار واقعی دل خوش کُن تھا۔ محمد کاظم کی طرح محمد سلیم الرحمان سے بھی کبھی نہیں ملا۔ خط و کتابت اور ٹیلیفون پر بات البتہ متعدد بار ہوئی۔ مؤخر الذکر اعلیٰ پایے کے مترجم ہی نہیں بہت اچھے شاعر اور نثر نگار بھی ہیں۔ عموماً کچھ نہ کچھ مجھے بھیجتے بھی رہتے ہیں۔ اپنا سب سے بڑا ناقد میں آپ ہوں۔ اس معاملے میں عرفی کا پیرو۔

خواہی کہ عیب ہاے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشین در کمینِ خویش

.....

میں بھی آپ اپنی گھات لگائے بیٹھا رہتا ہوں۔ اپنی تحریر میں کمیاں، کوتاہیاں ڈھونڈتا رہتا ہوں۔ اپنی کسی تحریر کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتا۔ جو چھپ جائے وہ ریکارڈ ہے۔ اس بات سے مطمئن ہوں کہ ملک کے اجلہ اہل علم و ادب نے میری تحریروں کو سراہا۔ لیکن میں:

گرچہ خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں

.....

کے چکر سے نکل نہیں پایا۔ نام کمانے اور خود کو منوانے کی خاطر نہیں لکھتا اس تعلق کو قائم رکھنے کے لیے لکھتا ہوں جو جناب احمد ندیم قاسمی اور خالد احمد سے قائم ہو گیا۔ جواب اس دنیا میں موجود نہیں بحمد اللہ میں تو ہوں:

تا بما نیم زندہ بر دوزیم
جامۂ کز فراق چاک شدہ
در بمیریم عذرہا داریم
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

.....

ورنہ اس ملک میں اچھے رسائل کی کمی نہیں۔ کئی مدیران نے میرا پتہ کسی نہ کسی طرح حاصل کر کے خطوط بھی لکھے۔ یک در گیر و محکم گیر کا قائل ہوں۔ صرف ایک شخص سے انکار کی ہمت نہ ہوئی، محبّ اور محبوب اختر حسین جعفری سے۔ 'فردا' کے نام سے کتابی سلسلہ (مجلّہ) شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے برٹرینڈ رسل پر مضمون لکھ دیا۔ یہ مجلّہ چھپ گیا تو مجھے بھی بھیجا۔ کچھ دن بعد انھیں انڈیا سے ایک خط ملا جس میں کسی نے انھیں لکھا کہ پورے مجلّے میں خاص الخاص طور پر پڑھنے کی کوئی تحریر تھی تو وہ برٹرینڈ رسل پر مضمون تھا۔ اتنے خوش ہوئے کہ وہی خط اپنے خط کے ساتھ مجھے بھی بھیج دیا۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا تھا بہرحال اسے پڑھ کر واپس بھیج دیا کہ ان کے ریکارڈ کی چیز تھا۔ کسی تحریر کی تحسین صاحب تحریر کی بھی تحسین ہوتی ہے اور اسے دوسروں کو پیش کرنے والے کی بھی۔ ان کی خوشی میری اور میری خوشی ان کی خوشی تھی۔

یکے ست نسبت شیرازی و بدخشانی
ایسے بے لوث لوگ اب دنیا میں کہاں۔

.....

اس سے بڑھ کر اردو دنیا کی معروف و مقبول شخصیت احمد ندیم قاسمی ہمہ جہت ادیب و شاعر منارادب کے خطوط مجھے ملتے تو کچھ نہ لکھنے کا ارادہ مجھے ہر بار ملتوی کرنا پڑتا۔ افلاطون کے اس قول ''یہ نہ دیکھو کس نے کہا یہ دیکھو کیا کہا جو کیمرج یونیورسٹی کا ماٹو چلا آرہا ہے۔'' کا قائل ہوں۔ چونکہ 'کیا' کو 'کس' سے الگ رکھنا میرے لیے مشکل رہا ہے، میرا قلم 'معقولیت کی حدیں پھاند بھی جاتا ہے۔ مجھے 'مقبولیت کی خاطر 'معقولیت' اور 'معقولیت' کے بدلے میں 'مقبولیت' درکار نہیں تھی اور نہ ہے۔ افلاطون کے قول اور مرزا غالب کے بول:

نفریں نہ زند سیلیٔ صرصر بہ چرا غم
تحسیں نہ دماند زرگ ساز من آوا

.....

نے مجھے اپنی ڈگر سے اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیا۔ منار ادب کی طرف سے قبولیت لکھتے رہنے کا جواز تھا۔ جب ان کی طرف سے ایسے خطوط ملیں تو از خود فیصلہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔

3 نومبر 2001

محب مکرم و محترم السلام علیکم

اب جب کہ 'فنون' کا شمارہ 115 چند روز کے بعد چھپ جائے گا آپ سے ایک جسارت کی معذرت کر رہا ہوں۔ کئی برس پہلے آپ نے علی عباس کے عام فکری مغالطوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا، بلکہ 'فنون' کے ساتھ آپ کے مبارک تعلق کا نقطۂ آغاز ہی یہی تھا۔ اس سلسلے میں آپ دونوں ارباب دانش کے درمیان ایک مکالمہ ہوا مگر پھر رک گیا۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ شاہ جی نے ہتھیار ڈال دیے تھے یا آپ نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بہر حال اسی سلسلے میں آپ کا ایک مقالہ میرے پاس غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ میں نے اسے مکرر پڑھا تو محسوس کیا کہ قارئین 'فنون' کو اس دانش پارہ سے محروم رکھنا زیادتی ہے۔ آپ سے اجازت حاصل کر لیتا مگر مجھے معلوم تھا کہ آپ اپنی تحریر پر نظر ثانی کا مطالبہ فرماتے اور ممکن ہے اس تحریر کی اشاعت روک لیتے۔ سو میں نے آپ کو مطلع کیے بغیر اس مقالے کی کمپوزنگ کرائی اور اس کے شروع میں ایک نوٹ لکھا، جس کا موضوع وہی تھا جس کا اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ اب چند روز میں یہ شمارہ شائع ہو رہا ہے تو آپ کو مطلع کر رہا ہوں کہ آپ میری اس جسارت کو معاف فرما دیں۔ اس تحریر کے بارے میں آپ کی رائے کچھ بھی ہو۔ آپ کے ایک عقیدت مند اور ایک بڑے رسالے کے مدیر کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ قارئین فنون کے لیے یہ مقالہ ایک نعمت ثابت ہوگا۔ میری پیشگی معذرت قبول فرمائیے۔

محترم محب عارفی صاحب نے آپ کو خط لکھا ہوگا۔ بہت دن پہلے انھوں نے مجھ سے آپ کا پتہ مانگا تھا۔ وہ بے چارے بصارت کے معاملے میں مشکل میں ہیں۔ میگنیفائنگ گلاس کی مدد سے پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے ان کے کسی استفسار کا جواب بھجوا دیا ہوگا۔

محترم کاظم صاحب اور رشید ملک صاحب آداب کہہ رہے ہیں۔ منصورہ بیٹی آپ کی خدمت میں آداب کہہ رہی ہے اور میرے ہمراہ دعا کر رہی ہے کہ آپ بخیریت ہوں اور بخیریت رہیں۔

میں دمہ کا مریض ہو چکا تھا مگر گزشتہ ایک ماہ کے دوران دوسرے کئی روگوں کا ہدف رہا۔ پرچے کی اشاعت میں اسی لیے تاخیر ہوئی۔ اب روبصحت ہوں آپ سے دعا کا طالب ہوں۔

خیر اندیش

احمد ندیم

چونکہ یہ مقالہ اس زمانے کی تحریر تھی جب علی عباس جلالپوری بقید حیات تھے اور جواب دے سکتے تھے، ندیم صاحب کا یہ خدشہ درست تھا کہ میں اسے نظر ثانی کے لیے منگو لیتا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ علی عباس جلالپوری

ہتھیار ڈالنے والے آدمی نہیں تھے، میں بھی نہیں تھا۔ بحث جاری رہتی تو بھی بے نتیجہ ختم ہوتی۔ بہرحال یہ مکالمہ میری طرف سے نہیں علی عباس جلالپوری کی عدم شرکت کے باعث ختم ہوا۔ میں نے اپنے مقالے کے آخر میں حافظ شیرازی کی نصیحت:

عیبِ مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو
نفیِ حکمت نہ کنی بہرِ دلِ عامے چند

.....

پر عمل کرتے ہوئے اپنے مقالے کا اختتام یوں کیا ہے:

'عام فکری مغالطے' اس لحاظ سے اہم حیثیت کی حامل ہے کہ اس کے ہر باب میں ان متوازی رجحانات سے بحث کی گئی ہے، جن میں ایک علوم و فنون کے ارتقا میں ممد و معاون ہے اور دوسرا رکاوٹ، وہ رجحانات جن کے غالب آ جانے سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی ترقی متاثر ہو سکتی ہے انہی کو فکری مغالطہ کہا گیا ہے اور ان کا رد کیا گیا ہے اس بات کو تو معرضِ بحث میں لایا جا سکتا ہے کہ وہ فکری مغالطے ہیں یا نہیں لیکن اس بات کو معرضِ بحث میں نہیں لایا جا سکتا کہ اس انداز فکر کا پروفیسر صاحب جسے مغالطہ کہتے ہیں کسی عہد میں غالب اور ہمہ گیر ہو جانا علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے ارتقا میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اس لحاظ سے 'عام فکری مغالطے' کی اہمیت نمایاں ہے اور غالباً اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جو دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے (اگرچہ عدم علم علم عدم کے مترادف نہیں لیکن حکم علم کی بنیاد پر ہی لگایا جاتا ہے لاعلمی کی بنیاد پر نہیں۔)

اگرچہ برٹرینڈ رسل کے دو مقالات

1- Ideas that have helped mankind.

2- Ideas that have harmed mankind.

ایسے ہی موضوعات پر ہیں لیکن انہیں کتاب نہیں کہا جا سکتا یوں اولیت کا درجہ اسی کتاب کو دیا جائے گا۔ بنا بریں وہ لوگ جو غور و فکر میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں ان کے لیے ہر باب ایک گائیڈ پوسٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر گائیڈ پوسٹ پر لغزش پا اور قطع منازلہا کی صورتوں کی واضح نشاندہی موجود ہے۔ یہاں تک بات افراد کے حوالے سے ہے معاشرتی اور سماجی حوالے سے 'عام فکری مغالطے' کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا کوئی مقالہ خلا میں معلق نہیں بلکہ ایک واضح سماجی اور معاشی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب انسانی معاشرے، تہذیب اور علوم و فنون کے داعی ہیں انھیں اس بات سے قطعاً دلچسپی نہیں کہ فرشتے کس قسم کے معاشرے میں رہتے ہیں اور وہاں ارتقا کی کون سی صورتیں ممکن ہیں۔ وہ انسانی معاشرے کے فرد ہیں اور ان کی دلچسپیوں کا مرکز و محور یہی معاشرہ ہے اور وہ اسی کے ارتقا

کے خواہاں ہیں۔ یہ مقالات خلاؤں میں گھور گھور کر نہیں لکھے گئے۔ وہ خلاؤں میں گھور کر سوچنے کے عادی نظر نہیں آتے۔ انھیں انسان اور نوع انسانی سے محبت ہے۔ یہ تعلق انھوں نے کہیں منقطع نہیں ہونے دیا۔ ان کا پسندیدہ معاشرہ مغرب کے تنزل پزیر اور بیمار معاشرے سے کہیں بہتر ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ وہ معاشرہ، جس کی بنیاد معاشی عدل وانصاف اور مساوات پر ہو اس معاشرے سے بہتر ہے جس میں یہ خوبی مفقود ہے۔ اس حقیقت کو کسی دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا نہ اس کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی حاجت ہے۔

'عام فکری مغالطے' کی اس خوبی کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ اس کے مطالعے سے فکر کو تحریک ملتی ہے اس کا ثبوت یہ سطور ہیں، جس نے یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد قلم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ جس نے سیدھے سادے اور آسان پیرایے میں اپنی سوچ کا اظہار اسی کتاب سے سیکھا۔ معلوم نہیں اس سلسلے میں اس کتاب کا قرض میری طرح اور کتنے لوگوں کے ذمے ہوگا۔

ہاں بانگ بلند است ایں پوشیدہ نمی گویم

.....

'فنون' کے اسی شمارے میں جس میں 'عام فکری مغالطے' پر میری تنقید کی تیسری اور آخری قسط شامل تھی، علی عباس جلالپوری کی طرف سے پہلی دو قسطوں کا جواب بھی شامل تھا۔ اس کا جواب میں نے ڈیڑھ دو گھنٹوں میں لکھ کر 'فنون' کو بھجوادیا۔ یہ جواب نامکمل تھا۔ قبل اس کے کہ مزید جواب الجواب لکھتا۔ ندیم صاحب کی طرف سے جو خط ملا اس میں علی عباس جلالپوری کی طرف سے ندیم صاحب کو ملنے والے خط سے یہ اقتباس بھی درج تھا۔

''میرے خیال میں اب سید صاحب اور آپ کے درمیان بحث جاری نہیں رہ سکے گی۔ تازہ نوازش نامے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''محمد ارشاد صاحب نے اپنے تجزیے کے آخر میں جس قدر شناسی کا ثبوت دیا ہے ان سے مباحثہ جاری رکھنا بے ذوقی ہوگا۔''

''یہ علمی بحث تھی جاری رہتی تو پڑھنے والوں کو بہت کچھ حاصل ہوتا مگر سید صاحب کی طرف سے بند کرنا ایسا ہے جس کی خلاف ورزی کی جسارت بہت مشکل ہے۔ آپ کی طرف سے جائزے کا جواب کا پہلا حصہ میرے پاس محفوظ ہے۔ اب جیسا بھی آپ ارشاد فرمائیں۔''

میں نے لکھ دیا کہ مجھے کسی کے خلاف محاذ کھولنا تو ہے نہیں۔ آپ اسے ضائع کر دیں۔ لیکن انھوں نے اسے ضائع نہیں کیا۔ میں بھی مزید اقساط لکھنے سے بچ گیا۔ 'فنون' کے اسی شمارے (17) کے بہرۂ اختلافات میں ڈاکٹر آغا افتخار حسین، جو خود بھی فلسفے کے آدمی تھے، کا خط بھی شائع ہوا۔

'فنون' کے اس شمارہ میں ایک اور اہم تحریر وہ فکری مناظرہ ہے جو کچھ عرصے سے جناب علی عباس جلالپوری اور جناب محمد ارشاد کے مابین جاری ہے۔ غالباً یہ اس سلسلے کی آخری قسط ہوگی کیونکہ عام فکری مغالطے کے ناقد نے اپنی بحث مکمل کر لی ہے اور اس طرح کی ہے کہ اب شاید علی عباس صاحب اس کا مزید جواب نہ دیں اس لیے نہیں کہ محمد ارشاد صاحب کی رائے سے مزید اختلاف کی گنجائش نہیں بلکہ اس لیے کہ محمد ارشاد صاحب نے اختلاف رائے کا جو اعلیٰ معیار پیش کیا ہے اس کے پیش نظر مزید کچھ کہنا غیر ضروری ہوگا۔ میں اس مناظرہ کا بہ غور مطالعہ کرتا رہا ہوں اور میں محمد ارشاد صاحب کے مقابلے میں علی عباس صاحب کے خیالات سے بہت حد تک متفق ہوں جس کا اظہار 'فنون' کے صفحات میں کر چکا ہوں لیکن جس بات سے میں بے حد متاثر ہوا وہ محمد ارشاد صاحب کا مطالعہ، علمی تبحر اور خصوصاً آخری قسط میں وہ خراج تحسین ہے جو انھوں نے علی عباس جلالپوری کو پیش کیا۔"

پس یہ مباحثہ جاری نہ رہ سکنے کی وجہ یہی تھی - القصہ فنون کے اس شمارہ (سالنامہ) میں علی عباس صاحب کی طرف سے، گزشتہ دو شماروں میں میری تنقید کا جواب بھی شامل تھا جس کا فوری جواب جیسا کہ کہہ چکا ہوں میں نے بھجوا دیا تھا، جو بیس بائیس برس تک ندیم صاحب کے پاس پڑا رہا اور بالآخر 'فنون' (119) میں چھپ گیا۔ اس کا جواب یوسف حسن (مرحوم) نے جو اچھے شاعر اور بہت اچھے نثر نگار، مارکسزم میں بہ نسبت اوروں کے زیادہ وسیع المطالعہ اور 'فنون' کے اہم قلمی معاون بھی تھے، اپنے اوپر فرض اور قرض گردانا جو 'فنون' (119) میں شائع ہوا۔ لیکن اسے شائع کرنے سے پہلے ندیم صاحب نے مجھے لکھا:

22 جولائی 2002

گرامی قدر آداب!

ہمارے ایک معاون یوسف حسن صاحب نے آپ کے اس مقالے کے بعض مقامات سے اختلاف کا اظہار ایک مقالے کی صورت میں بھیجا ہے، جو میں نے بیس بائیس برس کے بعد آپ کی اجازت کے بغیر 'فنون' میں درج کر دیا تھا۔ وہ اپنے زعم میں آپ کی ''فروگزاشتوں'' پر گرفت کر رہے ہیں۔ کہیں کہیں ان کا لہجہ مجھے بھلا نہیں لگا اور انھوں نے بھی اپنے خط میں مجھے اجازت دی ہے کہ آپ کو کہیں ''ناشائستہ شدت'' نظر آئے تو اسے بے شک حذف کر دیجیے یا بدل دیجیے۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو یوسف حسن صاحب کا یہ مقالہ فنون 117 کے لیے تو نہیں بلکہ فنون 118 کے لیے کمپوز کرا لوں میں نہیں چاہتا کہ آپ کو 'فنون' کے حوالے سے کوئی ذرا سی بھی شکایت ہو۔ اس لیے یہ

عریضہ لکھا ہے۔ آپ نے اجازت نہ دی تو مقالہ مصنف کو واپس کر دوں گا۔

خیر اندیش

احمد ندیم

میں نے جواباً لکھا کہ جس طرح مجھے دوسروں پر تنقید کا حق ہے اسی طرح دوسروں کو بھی مجھ پر تنقید کا ہے، کوئی کچھ بھی لکھتا ہے بلا تردد چھاپ دیا کریں۔ میرا آپ سے تعلق ایسا نہیں کہ اس میں رخنہ آ پائے۔ آپ پورا مقالہ بغیر کاٹ چھانٹ کے چھاپ دیں، ضروری ہوا تو جواب دے دوں گا ورنہ:

روز و شب عربدہ با خلق خدا نتواں کرد

....

لیکن جب یہ مقالہ شائع ہوا (فنون 119) تو طنز و تشنیع اور استہزا کے جو نشتر بج رہے تھے کچھ کم تیز نہیں تھے۔ خیر یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ایسی ہی بے اعتدالیاں مجھ سے بھی ہوتی رہیں اور ہوتی رہتی بھی ہیں لیکن چہ:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

....

رہی ہے کسی کو خفت سے دوچار کرنا بھی مقصد نہیں رہا۔

یوسف حسن 'فنون' کے مجھ سے بھی پہلے کے قلمی معاون چلے آ رہے تھے اور اچھا لکھنے والوں میں سے تھے، اچھے شاعر اور اچھے ناقد بھی۔ اردو کے آدمی تھے اور کسی کالج میں پڑھاتے بھی تھے۔ مارکسزم کے بارے میں وسیع المطالعہ بھی تھے۔ انھوں نے مارکس کے فلسفے پر بھی اپنے آپ کو اتھارٹی باور کر لیا اور علی عباس جلالپوری کا قائم مقام اور جانشین اور میرا روئے سخن اپنی طرف اور یہ بھول گئے کہ بزبان قابل اجمیری:

کچھ سمجھ کر ہی ہوا تھا موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا تھا عافیت ساحل میں ہے

....

علی عباس جلالپوری کے سے فاضل اجل سے سینگ اڑانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی، جو کچھ انھوں نے پڑھ رکھا تھا اس میں بہت کچھ میں نے بھی پڑھ رکھا تھا اور جو کچھ میں نے پڑھ رکھا تھا اس میں سے بہت کچھ انھوں نے بھی پڑھ رکھا تھا۔ ولی را ولی می شناسد۔

قصہ کوتاہ یوسف حسن کے مقالے کا جواب لکھنا پڑ گیا (فنون 120) - ان کے مقالے اور اپنے جواب کا خیال آتا ہے کہ تو اگر چہ:

نعل بالنعل للجروح قصاص

....

جروح کی نسبت قصاص کچھ زیادہ ہی لگتا ہے، جس کا مجھے افسوس رہے گا۔ جو نہیں جانتا اور نہیں جانتا کہ نہیں جانتا قابل درگزر ہے لیکن جو نہیں جانتا اور جانتا ہے کہ جانتا ہے کی بات اور ہے، جو لکھا اسی نقطۂ نظر سے لکھا اس کی پروا کیے بغیر کہ کوئی ناراض نہ ہو جائے:

اگرچہ کس نہ خرد جنسِ ناقبولِ مرا
چہ شیخ شہر دکانے کہ واشتم دارم

☆☆☆☆☆

قائم نقوی

خالد احمد دلدار بھی تھے اور دلداری کے رمز سے آشنا بھی جو ایک بار اُن کے حلقہ میں آجاتا، وہ حلقہ ندیم بن جاتا۔ قائم نقوی صاحب خالد احمد صاحب کے ساتھ آئے۔ خالد احمد کے انداز میں جو بے تکلفی اور طنز و مزاح کے درمیان مہین سی حرارت مہمیز ہوتی وہ ماحول سے تکلف داری ختم کر دیتی تھی۔ قائم نقوی صاحب کا تعارف اک شاعر اور شریف انسان کا تھا۔ اُس زمانے میں قائم نقوی صاحب رسالہ ''ماہِ نو'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ ''ماہِ نو'' کے دفتر میں بھی میں اُن سے ملنے دو چار بار گیا۔ جب ملتے زور دے کر کہتے، کچھ لکھا ہے تو ''ماہِ نو'' کو بھیجیں۔ اُن کے اندازِ بیان میں اپنائیت مُصفّا ہوتی۔ میں نے بذریعہ ڈاک ایک افسانہ ''ماہِ نو'' کو ارسال کیا اور لکھا اگر پسند آجائے تو ''ماہِ نو'' میں شائع فرمائیں شکریہ۔

مجھے میرا ایک افسانہ واپس بھی ملا جس پر ایک نوٹ تھا کہ کچھ لفظ زیادہ بے باک ہو گئے، دوبارہ نظرِ ثانی کریں۔ میں نے جب دوبارہ افسانہ پڑھا تو نقوی صاحب کا مشورہ رہنما لگا لہٰذا دوبارہ لکھ کر بھیجا تو چھپ گیا۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ ''ماہِ نو'' میں لکھی تحریروں پر

محمد حنیف

معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ایک روز دوپہر کے وقت آئے تو کہنے لگے آپ کے افسانے کے پیسے دفتر میں رکھے ہیں، آکر لے جائیں۔ رسیدی ٹکٹ ساتھ لے کر آنا۔

ایک روز خالد احمد صاحب نے کہا آج رات قائم نقوی صاحب کے گھر کھانا ہے۔ بیٹی نے قرآن شریف پڑھ لیا ہے۔ رسم اللہ (آمین) ہے۔ اُس زمانے میں نقوی صاحب کا گھر شمع سینما کے قریب تھا۔ اس تقریب میں کافی دوست احباب شریک ہوئے تھے۔ دعوت میں نقوی صاحب کے والد محترم سے بھی ملاقات ہوئی۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو معلوم ہوا کہ کرشن نگر حیدر روڈ پر شیعہ مسجد کی زمین اور تعمیر میں بزرگوں کا کردار ہے، خاص طور پر اعجاز رضوی صاحب کے والد بزرگوار کا قائم نقوی صاحب نے یہ بتایا۔ میرا نکاح والد صاحب کی خواہش پر اعجاز رضوی صاحب کے والد صاحب نے پڑھایا تھا۔

آغازِ تعارف سے آج تک میں دیکھ رہا ہوں کہ نقوی صاحب اور رضوی صاحب کی دوستی کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ محکمہ نے نقوی صاحب کا ٹرانسفر اسلام آباد کر دیا جہاں وہ کافی عرصہ رہے۔ گو درمیان میں آتے رہتے تھے۔ کرشن نگر میں مجلسوں کا انتظار ذاکروں کا انتخاب اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ محرم کے دنوں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ محکمہ نے جب دوبارہ لاہور ٹرانسفر کیا تو نقوی صاحب بطور ایڈیٹر رسالہ ''ماہِ نو'' تھے۔ دفتر وحدت روڈ پر تھا۔ گھر کرشن نگر میں میرے قریب تھے۔ صبح سیر کرتے وقت کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔

رسالہ ''ماہِ نو'' کے بارے میں عرض کروں گا۔ ''ماہِ نو'' کے سابقہ ایڈیٹران نے ''ماہِ نو'' کے کچھ ایسے خاص نمبر بھی شائع کیے جن کی حیثیت اک ادبی دستاویز کی ہے۔ بطور ایڈیٹر قائم نقوی صاحب نے بھی دو خصوصی نمبر ایسے شائع کے جو ایک حوالہ کا مقام رکھتے ہیں۔ ایک فیض نمبر، دوسرا احمد فراز نمبر۔ فیض پر بہت خصوصی نمبر شائع ہوئے مگر معیار، مضامین میں اگر کوئی پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ بھارت سے ''فن و شخصیت'' کا فیض نمبر ہے، جس کو دہلی سے صابر دت نے مرتب کیا۔ دوسرا فراز نمبر اس کے بھی کوئی مقابل ہے تو وہ اسلام آباد سے شائع کردہ ''ادبیات'' کا فراز نمبر..... ادب کا جو بھی طالب علم فیض، فراز پر تحقیق اور مقالہ لکھنا چاہے گا۔ ان کو گائیڈ لائن کے طور پر ''ماہِ نو'' ..... کے فیض نمبر اور فراز نمبر بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ معیار، مضامین کے علاوہ

کاغذ، پرنٹنگ، تصاویر، جلد بندی، قیمت میں بھی یہ نمبر یکتا ہیں..... اوران دو نمبروں کے حوالے سے قائم نقوی کے بطور ایڈیٹر کام کو ہمیشہ تحسین کے الفاظ سے یاد رکھا جائے گا۔

میں یہاں اپنی بات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ میرے چھوٹے بیٹے نے وکالت کا آغاز کیا تو وہ نظم بھی اس وقت کہہ رہا تھا۔ میں نے اُس کی چار نظمیں نقوی صاحب کو "ماہِ نو" کے لیے بھیج دیں۔ وہ چاروں نظمیں "ماہِ نو" میں چھپ گئیں اور اُن نظموں کا معاوضہ مجھے ملا یعنی میرے بیٹے کی پہلی کمائی جو مجھے ملی وہ نظموں کی تھی۔ ادب کے حوالے سے تھی۔ بیٹے نے اردو، انگلش پانچ کتابیں لکھیں جو جنرل نالج کی تھیں جن کو اُردو بازار کے ایک پبلشر نے شائع کیا تھا اور جب بیٹا نیب میں بطور ایڈیشنل ڈپٹی پراسیکیوٹر جنرل کیس کرنے لگا اور ڈی ایچ اے اسلام آباد، راولپنڈی لیگل ایڈوائزر لگ گیا تو اپنی قانونی ذمہ داریوں میں مصروف ہوگیا۔

قائم نقوی صاحب بطور ایڈیٹر "ماہِ نو" ریٹائر ہوئے تو سرکاری مکان کی سہولت ختم ہوگئی۔ اب پنشن پر گزارہ ہے۔ ان کے بیٹے برسرروزگار ہیں مگر عہدے اتنے بڑے نہیں کہ ضروری غیرضروری سہولتیں پوری کرسکیں۔ بہرکیف! نقوی صاحب کو ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی باقی جمع پونجی ملا کر ملتان روڈ چھپر سٹاپ پر مکان خرید لیا اور یوں ایک بنیادی مسئلہ حل ہوگیا۔ دوستوں کے مشورے سے حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری شپ کا الیکشن بھی لڑا۔ ایک ووٹ سے جیت بھی گئے۔ حلقہ ارباب ذوق کے میرے اور دوست بھی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے تھے۔ لیکن قائم نقوی صاحب واحد دوست تھے جو مجھے متعدد بار کہتے تھے۔ آپ اپنی کہانیاں حلقہ میں پڑھنے کے لیے جمع کروائیں۔ مزید حاضری بھی یقینی بنائیں تاکہ آپ کی ممبرشپ کے لیے میں کمیٹی کے سامنے بات کروں۔ اُن دنوں اجلاس ایوانِ اقبال میں ہوتے تھے۔ نقوی صاحب کے حکم پر میں نے چار، پانچ بار اجلاس میں حاضری لگوائی۔ اسی دوران قائم نقوی صاحب کو دل کی تکلیف بھی ہوئی۔ خدا نے کرم کیا، جلد صحت یاب ہوکر پھر متحرک زندگی میں شامل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا تھا کہ کل تک جب وہ "ماہِ نو" کے ایڈیٹر تھے۔ ادیب شاعران کی کرسی کے سامنے ٹیبل کے دوسری طرف کھڑے ہوتے تھے اور آج نقوی صاحب رجسٹر پکڑے کرسی کرسی دستخط لینے کے لیے

گھوم رہے ہیں۔
غالب کو عشق نے نکما کر دیا تھا
نقوی کو ریٹائرمنٹ نے ہیرو سے زیرو کر دیا

.....

احمد ندیم قاسمی، خالد احمد کی روایت کی پیروی کرتے ہوئے قائم نقوی نے بے شمار جونیئرز کو "ماہِ نو" کے ذریعہ روشناس کرایا۔ راجہ نیّر کا پہلا ٹائٹل قائم نقوی صاحب نے "ماہِ نو" میں 1989 میں شائع کیا تھا۔ اور یا مقبول جان (سابق بیوروکریٹ اور کالم نگار) رسالہ بیاض، کی ایک تقریب میں تقریر میں کہا: جب میری لاہور پوسٹنگ ہوئی، قائم نقوی پہلے شخص تھے، جنھوں نے حوصلہ دیا اور اہلِ قلم سے روشناس کرایا۔

1989 میں جب میں اپنے دوست اقبال احمد خان صاحب کے ساتھ حلقہ ارباب ذوق میں جانا شروع کیا، اُس وقت وائی ایم سی اے کی سیڑھیاں چڑھ کر نیلا گنبد کی طرف کارنر بڑا کمرہ تھا جس میں اجلاس ہوتے تھے۔ درمیان میں میز ہوتی، اردگرد کرسیاں اس ترتیب سے لگی ہوتی کہ ہر طرف سے صاحبِ صدر، پڑھنے والے سننے والے سب آمنے سامنے ہوتے۔ بعد میں نیچے گراؤنڈ فلور پر اجلاس ہوتے تھے۔ اُس وقت جن شخصیت کو میں نے اجلاس میں دیکھا، سُنا، اُن میں چند نام جو مجھے یاد آرہے ہیں۔ وہ لکھتا ہوں:

جناب صلاح الدین احمد صاحب، جناب صوفی تبسم صاحب، انتظار حسین، ناصر کاظمی صاحب، قیوم نظر صاحب، جاوید شاہین صاحب، اعجاز حسین بٹالوی صاحب، قدرت اللہ شہاب صاحب، ن م راشد صاحب، پروفیسر امین مغل صاحب، ڈاکٹر عزیز الحق صاحب، پروفیسر عزیز الدین صاحب، شیر محمد اختر صاحب، ظہیر کاشمیری صاحب، بیگم منٹو، ہمشیرہ منٹو، دخترانِ منٹو، حنیف رامے صاحب، کشور ناہید صاحب، الطاف فاطمہ صاحبہ، ندرت فاطمہ صاحبہ، انجم رومانی صاحب، شہرت بخاری صاحب۔

یومِ میراجی پر حیات احمد حیات صاحب کی اور ان کی بیٹیاں ستار پر راگ جے جے ونتی پیش کرتیں۔ اُس زمانے میں بھی اختلافات ہوتے تھے۔ ترقی پسند، غیر ترقی پسند، دایاں بازو، بایاں بازو، آزاد نظم، نثری نظم وغیرہ لیکن عزت، احترام قائم رہتا..... مگر آج میں جب کبھی حلقہ میں جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اب لڑائی ادب کی نہیں چودھراہٹ کی ہے، فقہ کی ہے جیسے شیعہ سُنّی، ایک دوسرے کے خلاف نفرت، غصہ، الزام تراشی کرتے ہیں۔

ایک مدت کے بعد میں پاک ٹی ہاؤس گیا تو

دیکھا، حیران ہوا۔ صدر صاحب کی میز اور کرسی سُرنگ نُما حصہ میں ہے، آگے پلر، دیوار ہے۔ سیڑھیوں سے چڑھتے ہی دو تین میزیں لگی ہیں جہاں لڑکے لڑکیاں چائے اور گپ شپ کر رہی ہیں۔ میں نے متعدد بار نجیب احمد صاحب، قائم نقوی صاحب، اعجاز رضوی صاحب سے ہر ملاقات میں عرض کرتا رہا - اجلاس کی ترتیب ٹھیک کریں۔ صدر کی میز کرسی سیڑھیوں کے ساتھ دیوار کے قریب ہو آگے کرسیاں ہوں۔ دوران اجلاس گاہکوں کو اوپر نہ بھیجا جائے۔ بہرکیف! کافی مدت کے بعد جانا ہوا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ترتیب ٹھیک کر لی گئی ہے، جن لوگوں نے یہ کوشش کی اُن کی تعریف کرنی چاہیے (چائے کا بھی ہاف سٹ فُل سیٹ بحال کرایا جائے)۔

قائم نقوی صاحب ایک روز آئے تو بتایا کہ انھوں نے ''نمود'' کے نام سے رسالہ کا ڈکلیریشن لے لیا ہے۔ دوستوں کو کہہ رہا ہوں غیر مطبوعہ چیزیں ''نمود'' کو بھیجیں اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے چیز وہ چھپے گی جو میرٹ پر ہوگی۔

''نمود'' شروع ہوا تو رسالہ لے کر خود دوستوں کے پاس گئے اور اُن سے کہا۔ میں ریٹائر ہوں رسالہ شوق اور ادب کی خدمت کے لیے شروع کیا ہے۔ اس لیے رسالہ قیمت دے کر لینا ہو گا۔ مفت نہیں ملے گا۔ بقول قائم نقوی صاحب دوستوں نے بہت تعاون کیا۔ اب چار سال ہو گئے ہیں ''نمود'' کو نکلتے ہوئے۔

قائم نقوی صاحب ''نمود'' کے لیے مواد جمع کر کے اس کی اشاعت اور پھر تقسیم تک کا کام خود کرتے ہیں۔ یہ کام بڑا صبر آزما ہے۔ یہ فقیر ان کی صحت کے لیے دعا گو ہے۔

میں نقاد تو نہیں جو قائم نقوی کی شاعری کا تجزیہ کروں یا اُن کا ہم عصروں میں مقام کا تعین کروں۔ ایک قاری کی حیثیت سے جو اشعار مجھے پسند ہیں اُن میں سے چند پیشِ خدمت ہیں:

میں منتظر دامنِ احساس ہوں قائم
اک اشک ہوں اور وقت کی پلکوں میں چھپا ہوں

سچ کو سچ لکھنے سے قائم ہم اکثر گھبرائے ہیں
جانے کتنے جھوٹ گھڑے تو دانشور کہلائے ہیں

اس شہرِ بے ہنر میں رہنا اگر ہے قائم
اک بے ہنر کی بیعت کریں تو کیا بُرا ہے

آنکھ کی لو میں ہے ضمیر کی لو
مجھ میں زندہ ہے رہنما میرا

کون جانے کس سے یہاں
ان سُنا اَن کہا ہو جائے گا

☆☆☆☆☆

احمد بشیر مکاتیب کے آئینے میں [بقیہ حصہ]

انھوں نے اس خط میں کمیونزم کے کامیاب نہ ہونے کی وجہ اس نظام معیشت و معاشرت کی خرابی نہیں قرار دیا بلکہ انھوں نے اس سٹالن اور اس کے دیگر رہنماؤں کے غلط اقدامات کو قرار دیا ہے جو کہ اس نظام کا لازمہ نہیں تھیں۔ اس خط میں ان کے دیگر مضامین کی طرح، سوشلزم کا گہرا مطالعہ جھلکتا ہے۔ وہ اس نظام کو احترام آدمیت، ایثار اور محبت کا پیغامبر قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حکمائے بالشویزم معاشرتی اور معاشی عدل کے داعی اور دیانت دار لوگ تھے انھوں نے کسی مالی منفعت کے لیے کام نہیں کیا دکھی انسانیت کے درد میں انھوں نے ٹسوے نہیں بہائے - ان میں سے کسی نے اسلام کو برا نہیں کہا۔ اللہ کو گالی نہیں دی انھوں نے تو یہ قرار دیا تھا کہ مذہب اللہ اور اس کی تخلیق کا باہمی معاملہ ہے۔ ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سوشلزم کے بارے میں احمد بشیر کے افکار ہمیں اقبال کے سوشلزم کے بارے میں تاریخی فرمان کی یاد دلاتے ہیں کہ سوشلزم جمع خدا برابر اسلام۔ اسی لیے اقبال نے کھلے الفاظ میں اپنے کمیونسٹ ہونے اپنی دانست میں دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف قرار دیا تھا۔ (خط بنام ایڈیٹر زمیندار محولہ بالا)

ہمایوں نے کسی مکتوب میں ایک ساتھ عمرہ کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر احمد بشیر نے معذرت کر دی۔ اس خط کے فحوائے عبارت سے لگتا ہے کہ ہمایوں نے جوابی خط میں انھیں بہت کچھ لکھا ہوگا۔ اس نے عمرے کی فضیلت جو ہماری رائج شریعت میں ہے اس کا حوالہ دیا ہوگا۔ اسی کے جوابی مندرجات سے احمد بشیر کے عقائد پر روشنی پڑتی ہے:

-- تم شاید اللہ کو وجودی ہستی سمجھتے ہو جو عمرہ کرنے سے خوش ہوتی ہے۔ اور کعبے سے باہر نکلتی ہی نہیں۔ خیر یہ باتیں کمزوری کی علامت ہیں اور اللہ قادر مطلق ہے۔ وہ کمزور ہو کر انسان کی سطح پر نہیں آ سکتا۔ وہ خالق اعلیٰ ہے۔ وہ تخلیق کا اصول ہے۔ وہ اس دور میں بھی تھا جب کعبے میں تین سو ساٹھ بت پوجے جاتے تھے اور اس وقت بھی تھا جب رسول اللہ کی بعثت ہوئی۔ وہ پندرہ ارب سال بگ بینگ سے پہلے بھی موجود تھا۔ مگر کیا وہ اسے پہلے بھی؟ کیا کرتا تھا؟ گھپ اندھیرے میں جب

محمد ظہیر بدر

نہ کائنات تھی، نہ روشنی، نہ آواز، نہ رنگ نہ کلام ---میں اللہ کی اتھارٹی کو چیلنج نہیں کرتا مگر میرا تعلق اس کی تخلیق کی سائنس سے ہے۔اس کا بھید کائنات کی داخلی ہیئت بتاتی ہے ----''(ص: ۹۲)

اسی خط میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ انھیں ایک علم جفر کے ماہر، شاد گیلانی نے قاعدہ بتایا تھا جس سے کہ انھیں ریس میں جیتنے والے گھوڑے کا پتا چل جاتا تھا۔انھوں نے یہ اسی قاعدے سے حساب لگا کر ایک دو جاننے والوں کو جیتنے والے گھوڑے کے بارے میں بتایا بھی تھا جو کہ واقعی جیت گیا تھا۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ مفلسی میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ نیلم کی فیس اور مکان کا کرایہ نہ دینے کی وجہ سے خودکشی کرنے پر آمادہ تھے مگر انھوں نے خود نہ ریس کھیلی کیونکہ وہ ریس کو جوا اور جوے کو حرام سمجھتے تھے۔پھر خود ہی اس کو جتلاتے ہیں کہ کیا مجھ سے زیادہ مسلمان کون ہیں جو ریس کھیلتے ہیں اور ویسے عام مسلمانوں کی طرح اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ مگر اللہ کا کہا نہیں مانتے۔ کیونکہ ہمیں مکتوب الیہ کے لکھے ہوئے خطوط دستیاب نہیں اس لیے احمد بشیر کے خطوط میں دیے گئے جوابات اور صفائی ہی سے سوالات اور اعتراضات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی خط میں لکھتے ہیں:

''بیٹا بہت سے عجیب راز ہیں جو تم جیسے سیدھے سادے مسلمانوں کی قسمت میں نہیں۔ مگر اتنی گنجائش تو چھوڑو کہ ابھی بہت کچھ نامعلوم ہے تاکہ تم ذہنی ترقی کرسکو--میں نے یہ خط جو ملفوف ہیں روک لیے تھے کیونکہ ڈرتا تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گے اور ناراض میں کسی کو نہیں کرتا۔اس لیے تم نے مجھے زندگی میں ہر ایک کے آگے چپ ہی دیکھا ہوگا۔ماں باپ کے آگے، بہن کے آگے، بیوی کے آگے، نیلم کے آگے اور اب تمہارے آگے۔ یہ نہیں کہ تم لوگ مجھے لاجواب کردیتے ہو بلکہ اس لیے کہ تم سب کے سب سمجھتے ہو کہ تم حق و باطل کے راز دار ہو اور میں ایک بیوقوف بوڑھا جاہل آدمی ہوں جس نے نہ کوئی مکان بنایا نہ زندگی میں کچھ حاصل کیا۔''(ص: ۹۳)

اپنے حالات کی تلخی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس قدر تلخ اور مشکل زندگی انھوں نے گزاری ہے اس کا تمھارے لیے تصور بھی ناممکن ہے۔ مگر میں اُف نہیں کرتا جبکہ تم ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہو۔یہاں پر وہ ایک دانشور سے ایک مہربان کا روپ دھار لیتے ہیں۔

''اگر کچھ میں نے اتنا کہہ دیا ہو جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا یا تمہاری طبیعت پر ناگوار گزرے تو مجھے ایک بیوقوف بوڑھا سمجھ کر معاف کردینا۔ آدمی سب کچھ کرسکتا ہے مگر اپنی ولدیت نہیں

بدل سکتا۔" (ص: ۹۴)

دراصل بیٹے کے سامنے باپ کی زندگی کے مختلف مراحل تھے - ایک معروف صحافی، سرکاری افسر، فلم ساز، سٹیٹ فلم اتھارٹی کا ڈائریکٹر جنرل- جب کہ ماحصل یہ کہ رہنے کو گھر کرایے کا، رہن سہن، پہناوا، عام سا- اس پر طرہ یہ کہ اپنی بیٹیوں کی پرورش میں سماج سے بغاوت، ہر حکومت سے دشمنی مول لینا- چنانچہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کے باپ کو جو مواقع ملے انھوں نے ضائع کر دیے اور اپنے نام نہاد اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک ناکام انسان کی طرح زندگی گزاری- احمد بشیر اس خط میں بھی اپنا مقدمہ بیان کر رہے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ میں نے نہایت ہنگامہ خیز اور مشکل زندگی گزاری ہے مگر چونکہ میں ایک بہت سمپل یعنی معمولی آدمی ہوں اس لیے اپنے بارے میں منہ سے کچھ نہیں کہتا- عزرائیل سے نہیں ڈرتا مگر اپنے بچوں کے سامنے ہاں جی ہاں کہتا ہوں یا چپ رہتا ہوں- مجھے کسی پر کچھ ثابت نہیں کرنا- میں کسی سے بڑا، کسی سے سیانا، کسی سے طاقتور نہیں ہوں- کتاب مجھے مل گئی ہے- اس میں وہ تین مضامین میرے کردار کے بارے میں ہیں- پھر الکھ نگری ہے جس کا قریباً آدھا حصہ میرے بارے میں ہے- وہ پڑھ لینا- اس سے تمھیں کچھ میرے بارے میں اندازہ ہو جائے گا- --- ایک بات پر البتہ مجھے بھی حیرت ہوتی ہے- وہ یہ کہ پچیس برس کی عمر سے پہلے جب ابھی میں نے لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا، ہندوستان کی بڑی ہستیوں سے میرے برابر کے تعلقات تھے- مصنفوں، ادیبوں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، میراجی، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، عصمت چغتائی، جوش ملیح آبادی، اوپندر ناتھ اشک، فیض احمد فیض، تاثیر، حفیظ جالندھری مجھے پچیس برس کی عمر کے بعد ملا- صحافیوں میں مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا غلام رسول مہر، سر عبدالقادر، سالک وغیرہ--- گویوں میں بڑے غلام علی خاں ---- لیڈروں میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین اور اب تو بہت سے نام یاد بھی نہ نہیں رہے- مثلاً صوفی تبسم، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر اجمل کو میں بعد میں ملا- تو پیارے بیٹے، کوئی بات تو مجھ میں ہو گی جو اتنے بڑے لوگ اور مختلف میدانوں کے لوگ مجھے برابر بٹھاتے تھے--- مگر یہ عجیب بات ہے کہ تمھیں مجھ میں کچھ نظر نہیں آتا- اور تم مجھے بیوقوف، لاڈھب اور بیکار آدمی سمجھتے ہو اور بات بات پر میری مذمت کرتے رہتے ہو- اگر تم ایک مکمل طور پر روایت پسند آدمی ہوتے تو بھی ایسا نہ کرتے میں تمھارا

باپ ہوں اور باپ کو روایت پسند لوگ قابل احترام سمجھتے ہیں۔" (ص: ۹۵)

ہر بڑے آدمی کا ایک المیہ ہوتا ہے۔ احمد بشیر کا یہ المیہ تھا کہ ان کی زندگی کے بارے میں جو کہ ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ بیٹے کو جو احساس از خود ہونا چاہیے تھا۔ وہ احساس بادل نخواستہ احمد بشیر اسے دلاتے رہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انھیں دنیا نے مانا۔ کیونکہ دنیا نے انھیں پڑھا تھا۔ مگر ان کے باپ اور بیٹے نے انھیں پڑھا ہی نہیں۔ ورنہ جو لوگ احمد بشیر کے قلم سے تنگ تھے۔ ان کی بے باکی سے ان کا مفاد متاثر ہوتا تھا۔ وہ بھی انھیں دیانت دار، سچا اور بہادر انسان مانتے تھے۔ مگر یہ بہادر انسان جو بھیڑیوں کے ساتھ رقص کرنے کا عادی تھا وہ اپنے بیٹے کو صرف اس لیے اپنی وقعت اور وقار بتا رہے ہیں کہ ان کے بیٹے کے دل میں اپنے باپ کے ناکام انسان ہونے کا جو ملال اور میل ہے وہ دُھل سکے اور وہ اپنے باپ پر فخر کرے۔ ان خطوط میں ان کے گہرے مطالعے اور دانشورانہ افکار کے ساتھ ساتھ ایک ایسے باپ کا سراپا ملتا ہے جو اپنے بیٹے کی قائم کی ہوئی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا اپنی صفائی پیش کر رہا ہے۔ الغرض درون خانہ و بیرون خانہ لکھے گئے خطوط میں احمد بشیر کے آدرشوں پر کھل کر روشنی پڑتی ہے۔

احمد بشیر اور ممتاز مفتی:

ممتاز مفتی سے احمد بشیر کو دیرینہ دلی تعلق تھا انھوں نے زندگی کے سال شبانہ روز ایک ساتھ گزارے مفتی کو جو خطوط لکھے ان میں ادب و دیگر معاملات کے علاوہ کہیں کہیں سیاست بھی در آئی ہے۔ مثلاً:

سب کہتے ہیں کہ قائداعظم نے غلطی کی تھی۔ ہمیں زمینداروں اور سرمایہ داروں اور فوج کے حوالے کر دیا اور اب اس کے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ جمہوریت وغیرہ سب جھوٹ ہے۔ ان سے لڑنا اس لیے مشکل ہے کہ انھوں نے عوام میں مذہبی اور علاقائی بنیادوں پر پھوٹ ڈال دی ہے۔ مگر اس احساس کی وجہ سے لوگ اکٹھے بھی ہو رہے ہیں۔ دھماکہ نہیں ہوگا مگر خیریت نہیں کیونکہ یہ لوگ افغانستان پر حملے کی سوچ رہے ہیں۔ امریکا ہی کا حکم ہے۔ (ص: ۱۱۱)

ایک خط میں ممتاز مفتی کو لکھتے ہیں:

میں نے گذشتہ برس سے تمھیں پڑھنا چھوڑ رکھا ہے کیونکہ تم اپنی پرانی کہانیاں دہراتے ہو۔ تم پہلا سا معیار بھی قائم نہ رکھ سکے۔ بیان کی شوخی بھی گئی اور کرافٹ میں بھی تم نے اپج نہ دکھائی۔ یہی تمھارا طرۂ امتیاز تھا ورنہ میں تمھیں پہلے بھی نہ پڑھتا۔ بات کرنی تمھیں آتی تھی اور اب بھی آتی ہے۔

مگر بات میں بات نہ رہی۔ پہلے عورت کا عورتا پہ دکھاتے تھے تو پڑھنے والے ماں بہن کو حیرت سے دیکھنے لگ جاتے تھے جیسے پہلے انھیں کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ دیوار کی طرف تکتی تھیں تو اس پر چہرے نمودار ہونے لگتے تھے۔ نہیں دیکھتی تھیں تو شک گزرتا تھا کہ دیکھ رہی ہیں۔ سوچ رہی ہیں۔ محسوس کر رہی ہیں۔ ایسی باتیں جو کوئی نہ دیکھ سکتا تھا نہ سوچ سکتا تھا، نا محسوس کر سکتا۔ تم جو زندگی کے تمام معاملات میں الو کے الو ہو، کتنے دانا لگتے تھے۔ مگر اب چولہوں میں اپلے نہیں جلتے۔ گھروں کی دیواریں چھوٹی ہو گئیں۔ زینے گھوم پھر کر چڑھنے کے بجائے سیدھے چڑھنے لگے اور وہ مڈل کلاس جسے تم جانتے تھے۔ موٹر سائکلوں پر سوار ہو کر تیر کی طرح سے نکل گئی۔ تم اسی مڈل کلاس کو نہیں جانتے مگر خوامخواہ موٹر سائکل پیچھے سواری کر رہے ہو۔ منزل تمھاری پہلے بھی کوئی نہیں تھی اور اب بھی تم کہیں پہنچ نہیں رہے ایسے بھٹکے ہوئے راہی کے ساتھ کون چلے گا۔ (ص:۱۱۵)

ممتاز مفتی کے ساتھ ان کا انداز بالکل جداگانہ اور نہایت بے تکلفانہ ہے۔ یہی دونوں کے تعلقات کی انفرادیت تھی۔ یوں لکھتے ہیں جیسے روبرو بیٹھے محو گفتگو ہوں۔ افسوس کہ مفتی کے لکھے ہوئے خط محفوظ نہیں لیکن باور کیا جاتا ہے کہ ان کا انداز بھی احمد بشیر سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ احمد بشیر کے بعض خطوں میں رمزیہ گفتگو بھی ہے۔ ممتاز مفتی کتاب ''روغنی پتلے'' ۱۹۸۴ میں شائع ہوئی۔ افسانوں کا یہ مجموعہ انیس برس بعد چھپا۔ فحوائے عبارت کو سمجھنے کے لیے ضرور ہے کہ روغنی پتلے میں ممتاز مفتی کی پہلی کہانی ''سندرتا کا راکشش'' کا مطالعہ کر لیا جائے۔ جس کے دیباچے میں ممتاز مفتی نے لکھا ہے۔ ''میری مشکل ہے کہ میں دو ہوں۔ ایک نہیں بن سکا۔ کوشش کے باوجود نہیں بن سکا۔ اس لیے میرا مشاہدہ خام رہا۔۔۔ میں وہ کہانی نہ لکھ سکا جو لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں وہ جوہر نہ پیدا ہو سکا جو قاری کا رخ بدلنے پر قادر ہو۔ میری زندگی میں افسانے نے کئی ایک چولے بدلے۔ پہلے ترقی پسندی کے تحت مزدور اور روٹی کپڑے کی بات چلی۔ ایسی چلی کہ فیشن بن گئی۔ سٹیٹس کا نشان بن گئی میں نے بہت کوشش کی کہ میری تحریر بھی فیشنی ہو جائے میرا بھی سٹیٹس بن جائے لیکن میں خود کو محدود نہ کر سکا اس لیے ناکام رہا۔ پھر خیال افروز کہانیاں آئیں۔ جو سوچتی زیادہ تھیں۔ محسوس کم کم کرتی تھیں۔ سوچنا مجھ سے اپنایا نہ گیا۔ میرے نزدیک ادب سوچ نہیں جذبات ہیں۔ جو انسان کو انسان کے قریب تر لے

آتے ہیں۔۔۔"

(میری بات، دیباچہ، روغنی پتلے)

اب جواب آں غزل کے طور پر احمد بشیر کا اس فسانے پر ان کا محاکمہ اور تبصرہ و تنقید کا یہ انداز ملاحظہ کریں:

"ساری عمر میں نے تمھیں عقل سکھائی اور ناکام رہا۔ اب خوامخواہ بنتے ہو۔ گویا تمھیں راستے کی تلاش کبھی تھی جیسے تم جلتے دیے دیکھ دیکھ کر چلتے تھے۔ یعنی تمھیں کہیں پہنچنا بھی تھا۔ تم نے جھوٹ بولا۔ تم تو خالی خرابی ساتھ لے کر آئے تھے۔ تم لتھڑے ہوئے پیدا ہوئے اور ان شاء اللہ لتھڑے ہوئے مرو گے۔۔۔ یہ تم نے مجھے سمجھایا کہ جو آگے چلتا ہے دراصل پیچھے چلتا ہے۔ عورت جب چھپتی پھرتی ہے تو دراصل تعاقب کی لذت میں اضافہ کرتی ہے۔ وجے وتی ان پورنی۔ سب جسم کی بھنبھیری میں ہے۔ پھر کی اپنی جگہ پر گھومتی رہتی ہے اور لٹو تو سیدھا سادا سیکس سمبل ہے۔ ان سے وہ عورت بیان نہیں ہو سکتی جن کا تعارف تم نے کروایا۔ گھومنا اور جھومنا ان کی ایک خصوصیت ہے۔ جیسے سانس لینا مگر ان کی زندگی گھومنے اور پھرنے سے بہت زیادہ ہے۔ میں زندگی بھر جلدی میں رہا۔ مجھے ان کی کھٹکا راچھی لگی تو میں نے انھیں اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ تم ان کے ساتھ ساتھ ناچتے رہے اس لیے جو کچھ تم جانتے ہو، میں نہیں جانتا۔ تمھیں بہت فرصت ہے بھائی۔ تمھارے اندر جو جوگی ہے وہ بڑا الوبھی ہے کنڈ پر بیٹھا صندل کا ہون کرتا ہے۔ من کی مالا جپتا ہے۔ منتر جاپتا ہے۔ ہڈیاں دھیرے دھیرے جلاتا ہے جن سے اس کی رگوں میں سلگتا ہوا دھواں بھرا رہتا ہے۔ یہی تمھارا سچ ہے۔ یہی تمھارا ڈیوٹ ہے۔ دراصل تمھیں کہیں بھی نہیں جانا۔ تمھیں کسی راستے کی ضرورت نہیں۔ کیوں دوستوں کو بدنام کرتے ہو۔ کیا تمھاری آلودگیوں کے ہم ذمہ دار ہیں؟ کیا تم نے ہماری بات کبھی مانی؟ ہماری کوئی بات مانی ہوتی تو زندگی میں یوں ذلیل و خوار نہ پھرتے بلکہ کامیاب اور خوشحال زندگی گزار کر کب کے مرکھپ گئے ہوتے۔۔" (ص:۱۱۶)

"آج کا قاری زندگی سے گریزاں ہے وہ حقائق کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اسے فرار مطلوب ہے۔ وہ تمھارے سیتا ہرن کو دیکھتا ہے مگر دائرے سے نہیں نکلتا جو اس کے گرد کھچا ہوا ہے وہ تمھارے ساتھ نہیں چلے گا۔ پھر تم اپنی کتھا کس کو سنا رہے ہو۔ رہیں تمھاری محبوبائیں! تو انھوں نے بھی برقعہ چھوڑ اور نیکر پہنی۔ مجھے اچھی لگتی ہیں اس طرح کیونکہ انھیں دیکھتے ہی میرا سفلی جسم فوراً مخاطب ہو جاتا ہے اور لذت ساری جسم

ہی جسم ہے۔ تم رس کے بھنورے اس کے اورے تورے لاگے رہو پھولوں کی پتیاں گنتے رہو، ان کے پرت کھولتے رہو، خوشبو سونگھتے رہو، شہد کھانا مکھیوں کی قسمت میں لکھا ہے جو ڈنگ مار کر اپنی راہ لیتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر اب سمجھے کہ عورت اور مرد میں رفاقت، سنگت اور مساوات صرف ورکنگ کلاس میں ممکن ہے۔ یہ تم نے کیسے مان لیا؟ تم تو ساری عمر سٹیٹس کے علمبردار رہے۔ میں سمجھاتا تھا تو تم مسکرا کر ٹال دیتے تھے۔ جیسے میں حماقت کی بات کرتا ہوں۔ اب کہو! یہ بصیرت تمھیں کہاں سے ملی؟ تم اس قابل ہی نہ تھے کہ زندگی سے کچھ سیکھ سکو۔ ترقی پسند یہی بات کرتے تھے مگر تم نے انھیں گالیاں دیں۔" (ص:۱۱۷)

یہ تو تھا ممتاز مفتی کی تخلیقات پر تنقید کا منفرد انداز۔ ممتاز مفتی کے ساتھ اختلاف رائے کے بارے میں ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

مگر یہ حقیقت بھی ان کے خطوط ہی سے آشکار ہوتی ہے کہ انھیں ادب تخلیق کرنے اور ناول لکھنے کے لیے بھی ممتاز مفتی ہی نے اکسایا تھا اور ناول نگاری میں ان کے سامنے ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی" اور "الکھ نگری" ہی بطور ماڈل تھے۔ خاص طور پر ان کا اسلوب الکھ نگری سے زیادہ قریب ہے۔ مفتی کے نام مختلف اوقات لکھے گئے خطوط میں ان کے ناول لکھنے کی پیش رفت اور اس دوران پیش آنے والی مشکلات کا پتا چلتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے آپ کو کبھی ادیب نہیں سمجھا۔ حالانکہ تم نے چاہا بھی اور کوشش بھی کی۔ اسی لیے میں نے جو برے بھلے خاکے لکھے تھے، شائع نہیں کروائے اور ناول ختم کرنے کی بھی میرے دل میں شدت سے آرزو نہیں۔" ص:۱۳۶-۱۳۷)

اس سے پہلے ایک خط میں ناول کے بارے میں یوں اپنی بے زاری کا اظہار کرتے ہیں:

"ناول میری جان کے پیچھے پڑ گیا۔ ختم نہیں ہوتا اور گرمی میں لکھا نہیں جاتا" (ص:۱۳۱) اس کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں: "آخر تم نے مجھ سے ناول لکھوا ہی لیا۔ ابھی ساڑھے چار سو صفحے لکھے ہیں--- ناول سے میں ڈرتا تھا مگر اب کوئی ڈر نہیں رہا۔ سمجھ لیا کہ مجھے تکنیک نہیں آتی مگر لکھنا تو آتا ہے۔ اور کوئی نیا راستہ نکالوں گا۔ ہمیشہ میرے ساتھ اسی طرح ہوا۔ یہ ناول بھی بالکل نئی قسم کا ہے۔ اور شاید کسی کو پسند بھی نہ آئے۔" (ص:۱۲۴)

ایک اور خط میں اپنے ناول لکھنے کی پیشکش اور مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں

"میرا ناول، ابھی ایک اور مہینہ لگے گا۔

میں نے نو سو صفحے لکھ لیے۔ بہت لمبا ہو گیا ہے۔ مگر واقعات کی گرہیں کھلتی جا رہی ہیں میں کیا کروں؟'' (ص:۱۱۲)

اگلے خط میں یوں رقم طراز ہیں:

''میں ناول میں پھنس گیا ہوں۔ بھٹو کی پھانسی کے بعد سارا پس منظر بدل گیا۔ آخری حصہ مجھے پھر سے لکھنا پڑے گا اور ابھی حالات واضح نہیں۔ پتا نہیں اندر کیا ہوا؟ یہ ناول تین حصوں میں ہے۔ پہلا پیڑھیاں۔ پاکستان بننے تک۔ دوسرا سیڑھیاں۔ پاکستان سے یحییٰ خاں تک اور تیسرا شہید گنج۔ یحییٰ خاں ڈھاکا اور بھٹو کی پھانسی۔ اور یہ حصہ سخت بھی ہے اور سیاسی بھی۔ اس لیے ناول پاکستان میں نہیں چھپ سکتا۔ کسی دوسرے ملک میں چھپوانے کا انتظام ہو جائے گا۔ اس کا کل حجم، ایلی کے برابر ہو جائے گا۔۔۔۔۔ میں نے آئندہ زندگی میں لکھنے سے توبہ کر لی ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے یہ ایک ہی بہت ہے۔ تمہارا کمال ہے کہ ساری عمر لکھتے رہے اور نہ تھکے۔ مجھ میں اتنا دم نہیں۔'' (ص: ۱۱۳)

ان کے خطوط میں اس دور کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے جن سے احمد بشیر گزر رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اس عہد کا ضمیر بھی، شرمندہ شرمندہ سا نظروں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ممتاز مفتی کے نام ایک خط میں جب اپنے حالات کا ذکر کرتے ہیں تو تیور بالکل مختلف ہیں:

''میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ اب کوئی امید باقی نہیں رہی اور کسی کام کے ملنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آگے بھی تباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ تباہی ہی تباہی ہے۔ میں نے مانو کی شادی کے لیے آخری مرتبہ اپنے سالے سے قرض لے لیا اور اب کسی کے پاس کچھ نہیں۔ اب واقعی مجھے کچھ پریشانی شروع ہوئی ہے۔ اس دور نے امید بھی چھین لی ہے۔ اب روٹی کھانے کی کوئی شکل نہیں رہی۔'' (ص:۱۴۱)

ان کے خطوں سے ان کی شخصیت کا ایک اور دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے ایک تو ان کا علم جفر سیکھنا اور دوسرا ہومیو، بائیو کیمک کے طریقہ علاج میں دلچسپی؛ پچھلے صفحات پر خط بنام ہمایوں میں انھوں نے اپنے ایک ہنر کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے شاد گیلانی سے سیکھا تھا کہ ریس میں جیتنے والے گھوڑے کا پیشگی پتا لگانا۔ انھوں نے اپنے ایک ہم مکتب پر اپنے اس علم کی استعداد کو آزمایا بھی اور وہی گھوڑا جیتا جس کے بارے میں انھوں نے موصوف کو بتایا تھا۔ مگر انھوں نے جان بوجھ کر اس علم کا ریس کھیل کر فائدہ اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ وہ اس پیسے کو حرام

سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ایک خط بنام کرنل عباس (داماد) میں اپنے علم جفر میں دسترس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی تلاش میں بفضل ربی کامیاب ہوا اور اب کچھ اسرار مجھ پر کھل گئے ہیں۔ میں علم کامل سے ہم کلام ہوں۔ پوچھا: امریکا عراق تنازعہ کیسے طے ہوگا؟ جواب آیا: عرب خلیج جنگ سے پہلے۔ پوچھا: احمد بشیر کے مرض کی دوا کیا ہے؟ جواب: دوا مرض دور نہ کرے گی۔ پوچھا: جتوئی کے بعد کون وزیر اعظم ہوگا؟ جواب: بے نظیر ہوگی۔ پوچھا: اسے مرکز میں کتنی سیٹیں ملیں گی؟ جواب: ایک سو ایک۔ مگر ایک سو تین ایک سو چار اور ایک سو سات بھی بنتا ہے وغیرہ۔ مگر ابھی میری تلاش جاری ہے۔ ابھی میں درجہ کمال تک نہیں پہنچا۔ اگر مجھے فارسی اچھی طرح آتی تو کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ اس مضمون کی قلمی کتابیں میں نے خدا جانے کہاں کہاں سے جمع کر لی ہیں۔ میرے بعد ان کا کیا حشر ہوگا۔" (یہ کتب اور مخطوطے پلاک لائبریری، لاہور میں موجود ہیں)

اپنے منہ بولے بیٹے مجید احمد کے نام کراچی ایک خط میں علم جفر کے بارے میں ایک کتاب کی بابت یوں رقم طراز ہیں:

"مجھے جس کتاب کی تلاش تھی، اس کا نام ہے ارواح الجفر۔ اس کے مصنف شفق رام پوری تھے۔ اب فوت ہو گئے ہیں۔ وہ کاشف البرنی کے ساتھ کام کرتے تھے وہ بھی فوت ہو گئے ہیں۔ مگر سب کچھ اپنی بیٹی کو بتا گئے ہیں جس کا نام مجھے معلوم نہیں۔ اس کتاب کی ایک جلد اس خاتون کے پاس ہے۔ اگر کسی طرح رسائی حاصل کر سکو تو اس کی ایک فوٹو کاپی مانگ لو۔۔۔۔" (ص:۱۹۵)

نیز انھوں نے اپنے متعدد مکتوب الیہان کو مختلف امراض کے لیے مختلف بائیو کیمک سالٹ تجویز کیے ہیں۔ بعض خطوط میں ان کے اپنے زیر استعمال ادویہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ چند خطوط سے اقتباسات ملاحظہ کریں:

"۔۔۔۔۔اور ہومیو پیتھک علاج جاری رکھو اور انھی کے ٹانک زیادہ کھاؤ۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گی (خط بنام محمودہ بیگم از انڈیانہ یونیورسٹی، امریکہ ص:۲۳)

"تم Apis-30 کے دو ڈرام منگوا کر انھیں دو۔ وہ روزانہ تین مرتبہ ایک ماہ کھائیں۔ ان شاء اللہ فائدہ ہوگا" (خط بنام ممتاز مفتی۔ ص:۱۱۱)

"میرے خیال میں تمھیں اب Sepia 6 کھانی چاہئے۔ ہزار سے ہزار خون اور بہہ سکتا ہے اور اتنی مونیم کڈوم کے لیے شرط ہے کہ زبان پر سفیدی جمی رہتی ہو۔ ابھی

Sepia کو دس دن اور آزماؤ۔ چار پڑیاں روزانہ۔ میرے خیال میں یہ دوائی اچھی ہے۔ (خط بنام ممتاز مفتی۔ صص:۱۱۱،۱۱۲)

قیصرہ حمید علوی کے لیے میں نے تھوجا سی ایم دیا مگر بھول گیا کہ اس کے ساتھ پیاز کھانا حرام ہے۔ اب میں نے اسے خط لکھ دیا ہے کہ وہ اشفاق صاحب (اشفاق احمد نہیں) سے ملے اور ایک خوراک اور لے لے۔ (خط بنام ممتاز مفتی ص:۱۲۳)

"امید ہے تم نے کالی ملف 3 x کھانی شروع کر دی ہوگی۔ واپس آ کر میں نے کاشی رام کی بایو کیمک سائنس نامی کتاب میں اس دوا کی مزید تفصیل پڑھی۔ اس سے میرا خیال اور پختہ ہوا (خط بنام ممتاز مفتی ص: ۱۲۹)

"میں نے تنگ آ کر Thuga CM کھانی حالاں کہ Kent میں میری علامات نہیں ہیں۔ اس سے میں نوے فیصد ٹھیک ہو گیا۔..... تم بھی ایک پڑیا کھالو" (خط بنام ممتاز مفتی ص:۱۳۳)

"دوائی میری کالی کارب ہے مگر اثر نہیں کرتی۔ ڈاکٹر اختر کہتا ہے سورا ہے مگر ٹوٹتا نہیں۔ یہ ہومیوپیتھی کے تاریک گوشے ہیں۔ سورا ٹوٹنے کی حتمی دوا کون سی سی ہے نہیں معلوم۔ میں سلفر سورائینم، کلکیریا کارب، بٹ کلونیم، میڈورائنم نیٹرم سلف، ہیسلینیم، سفلیشیم وغیرہ کھا چکا۔ (خط بنام ممتاز مفتی ص:۱۴۶)

"بیٹا، بیٹی کی رپورٹ تم نے نہیں بھیجی۔ مگر تم اس کو Natrum Mur 200 کی ایک قطرے کی خوراک ہفتے میں دو مرتبہ ایک مہینہ تک دو اور لکھو کہ مزاج میں کچھ فرق پڑا کہ نہیں....." (خط بنام مجید احمد ص:۲۰۱)

ان کے علاوہ انھوں نے اپنے منہ بولے بیٹے، مجید احمد (کراچی) کو جو خطوط لکھے ان کا موضوع پاکستان کی موجودہ سیاست ہے۔ ان خطوط میں انھوں نے جن سیاسی رہنماؤں کے بارے میں لب کشائی کی ہے انھیں عوام کے بعض طبقوں میں اعتبار حاصل ہے۔ بغیر شواہد و ثوابت پیش کیے گئے خیالات متنازعہ فیہ ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسے خطوط کہ جن کی ادبی و تاریخی اہمیت مسلم نہ ہو انھیں کتاب میں شامل کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوتا۔ کیونکہ ادیب سب کا سانجھا ہوا کرتا ہے۔ اس سے محبت کرنے والوں میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن سے اس کے سیاسی عقائد یا مذہبی رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ مگر اپنے فن کی سطح پر کسی خاص وصف کے باعث وہ مختلف العقائد قارئین کا پسندیدہ لکھاری ہوتا ہے۔ یہی معاملہ احمد بشیر کے ساتھ ہے۔ لوگ ان کی صاف گوئی اور پیشہ ورانہ دیانت داری کو سراہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ذاتی اور نجی

خیالات کو طشت از بام کرنے کی افادیت محل نظر ہے۔ ان خطوں میں احمد بشیر نے جن سیاستدانوں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے وہ تجزیاتی نہیں بلکہ سطحی ہے۔ ان کے بارے میں احمد بشیر کی پیش گوئیاں، ان کے خیالات خالصتاً ذاتی ہیں اور کہیں کہیں جانبدارانہ بھی ہیں۔ بالعموم کراچی کے بارے میں بالخصوص کراچی کی لسانی اور سیاسی تنظیم کی ریشہ دوانیوں اور ان کی پنجاب کے بارے میں غلط فہمیاں۔

ان خطوط میں البتہ اپنے کالموں کی طرح انھوں نے کھل کر پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور مفاد پرست حکومتوں اور سادہ لوح عوام کو بیوقوف بنا کر اپنے مفادات حاصل کرنے والی قوتوں کے بارے میں اپنا بالغانہ نقطۂ نظر بیان کیا ہے اور مختلف مثالیں دے کر اس مغالطے کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جس میں پاکستان کے چھوٹے صوبوں کے بھولے بھالے عوام مبتلا ہیں۔ مگر اپنے خطوں کے آئینے میں احمد بشیر اپنی تحریروں اور غالب رویے سے بہت مختلف ہے۔ ان خطوں میں وہ ایک مشفق باپ جس کا عقیدہ دہریت نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی ہمہ وقت توقع ہے۔ احمد بشیر کے بارے میں یہ خیال یکسر غلط ہے کہ وہ اول و آخر کمیونسٹ تھے یہ ان کا دعویٰ بھی ہے جو انھوں نے جہاں تہاں کیا ہے مگر ان خطوط کے آئینے سے جھانکنے والا احمد بشیر یکسر مختلف ہے۔ وہ عام انسان کی طرح پیسے کی خواہش بھی کرتا ہے۔ وہ ہاتھ تنگ ہونے پر کسمساتا اور پریشان بھی ہوتا ہے۔ جو اپنی بیٹی کی خانہ آبادی کے لیے عام باپ کی طرح پریشان ہے جو معاملہ جو اور صلح پسند سر ہے۔ جو دوستوں کے ساتھ ابریشم کی طرح کا رویہ رکھتا ہے۔ اولاد کو دعائیں دیتا ہے۔ وفا پرست بیوی کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے اور اپنی اولاد اور بیوی سے یکساں محبت کرتا ہے۔ اس کے برعکس احمد بشیر نے اخبار کے صفحات پر جو لکھا لگی لپٹی کے بغیر لکھا۔ ان کے خاکوں اور ناول نے عوام و خواص پر ان کے افکار اور احساسات اور اخلاقی مسلک کو واضح کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر ان کے خطوط نے نکال دی۔ چنانچہ احمد بشیر کے احوال و آثار کا مکمل ان کے لکھے ہوئے خطوط کے مطالعے سے مشروط ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خاکوں کا مجموعہ ''جو ملے تھے راستے میں'' (مرتبہ یونس جاوید)، الفیصل، لاہور

۲۔ خطوں میں خوشبو مؤلفہ نیلم احمد بشیر الفیصل، لاہور

۳۔ میں اور احمد بشیر، مضمون مشمولہ کتاب، دو تحریریں، سنگ میل، لاہور

۴۔ ڈانسنگ وود وولف (انگریزی کالموں کا مجموعہ) احمد بشیر، طابع، جنگ پبلشرز

۵۔ روغنی پتلے، ممتاز مفتی۔

☆☆☆☆☆

کثیر الجہت شخصیت صفدر ہمدانی کی ادب کہانی

کہتے ہیں کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہم محترم صفدر ہمدانی کی کامرانی کو دیکھیں تو اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے پیچھے محض ان کی جیون ساتھی کا ہاتھ نہیں بلکہ وہ سرتاپا کارفرما نظر آتی ہیں اور ہمارے محترم صفدر ہمدانی صاحب کسی جھجک کے بغیر برسرِ محفل اس حقیقت کے معترف بھی دکھائی دیتے ہیں۔

محترم صفدر ہمدانی ایک زندہ دل ادبی شخصیت ہی نہیں، ایک جیتی جاگتی محفل اور متحرک ادارہ بھی ہیں - ادب، ثقافت، صحافت، براڈ کاسٹنگ، صداکاری، تحقیق، مرثیہ خوانی، ریڈیو اکیڈمی کے استاد اور سفر نامہ نگاری کی دنیا میں انھوں نے جو نام، مقام اور احترام کمایا ہے، وہ ہماری تاریخ کا ایک تابناک باب ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب، ابلاغیات اور براڈ کاسٹنگ کے جن جن شعبوں میں محترم صفدر ہمدانی صاحب نے قدم رکھا، وہاں ایسے نقوش ثبت کئے ہیں، جو ان شعبوں میں نئے آنے والوں کو نئی راہیں سجھا رہے ہیں - مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ محترم صفدر ہمدانی کا نام اور کام ایسا ہے، جس کے ذکرِ خیر کے بغیر ہماری ابلاغیات، نشریات اور منقبت نگاری کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔

دنیائے ادب و نشریات میں محترم صفدر ہمدانی اور محترمہ مہ پارہ صفدر کی جوڑی مشہور بھی ہے اور معروف و مقبول بھی۔ جیون بندھن میں بندھنے سے پہلے یہ مہ پارہ زیدی تھیں اور پی ٹی وی پر اسی نام سے انھوں نے نیوز کاسٹر کی حیثیت سے شہرت سمیٹی - دونوں نے 1979 میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اور شانے سے شانہ ملا کر اکٹھے سفر شروع کیا تو مہ پارہ زیدی مہ پارہ صفدر بن گئیں اور اب انہیں دنیا اسی

ظفر معین بلے جعفری

نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ یہ ان دونوں کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں جیون ساتھی بھی انھی کی دنیا کا ملا۔ اس ادبی جوڑے کی خصوصیات اور پس منظر میں بھی بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں کا بُرج یعنی عقرب ایک ہی ہے۔ یہ دونوں نومبر کے مہینے میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ دونوں کو ادبی ذوق و شوق ورثے میں ملا۔ صفدر ہمدانی صاحب کا ذکر ہوگا بعد میں۔ پہلے بات ہوجائے محترمہ مہ پارہ صفدر اور ان کے حسب نسب کی۔ ان کے والد محترم سید حسن عباس زیدی شاعر، ادیب اور استاد تھے۔ جبکہ ان کی والدہ ماجدہ سیدہ شمس الزہرہ نے سوزخوانی میں نام اور مقام کمایا۔ میڈم مہ پارہ صفدر نے انگریزی ادبیات میں ایم اے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ اور اسی دوران ریڈیو پاکستان پر یونیورسٹی پروگرامز میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حوصلہ افزائی پر ریڈیو پاکستان لاہور میں متعدد شعبوں میں پروگرام کیے اور یہیں سے پاکستان ٹی وی لاہور مرکز پر نیوز کاسٹنگ کے لیے منتخب ہوگئیں اور اس شعبے میں ابصار عبدالعلی اور عزیز الرحمٰن نے ان کی رہنمائی کی۔ بعدازاں لاہور کے بعد وہ پی ٹی وی کی قومی نشریاتی اسکرین پر نیوز کاسٹر کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان میں کوئی پرائیویٹ ٹی وی چینل متعارف نہیں ہوا تھا، لہٰذا ملک بھر میں جلد ہی ان کا ایک نام اور مقام بن گیا۔ عالمی سطح پر اپنے پیشہ ورانہ جوہر دکھانے کے لیے یہ جوڑا برطانیہ چلا گیا، جہاں یہ دونوں میاں بیوی بی بی سی اردو سروس سے منسلک ہوگئے۔ صفدر ہمدانی چار سال کے لیے ماہر لسان کے طور پر ریڈیو جاپان گئے تو جنوری میں ماہ پارہ بی بی سی لندن کی اردو سروس سے وابستہ ہوگئیں جہاں نشریاتی ادارے سے وابستگی کے ساتھ ساتھ مہ پارہ صفدر نے لندن یونیورسٹی سے ویمن اسٹڈیز میں ماسٹر کی ڈگری بھی لے لی۔ صفدر ہمدانی جاپان سے لندن آکر بی بی سی سے وابستہ ہو گئے اور یہ جوڑا آگاہی کے اجالے پھیلاتا رہا۔ اس نامور جوڑے کا شعبہ ایک ہونے اور ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے مشکلات آسانیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔

صفدر ہمدانی نے جاپان کی وزارت خارجہ میں افسران کو اردو پڑھانے کا کام کیا اور اسی طرح برطانیہ کے سرکاری حکام کو بھی اردو پڑھاتے رہے۔

محترم صفدر ہمدانی صاحب ایک قدآور ادبی شخصیت ہیں۔ ان کے قد و قامت کو دیکھنے کے لیے مجھے دونوں ہاتھوں سے اپنی ٹوپی سنبھالنی پڑتی ہے۔ میں ان کے کام اور کلام سے فیض یاب تو ہوتا رہا ہوں لیکن اس کا ناقدانہ جائزہ لینا میرا منصب نہیں۔ انھوں

نے جو کام کیا ہے، وہ کوئی شخصیت تن تنہا کر ہی نہیں سکتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ کوئی ایک شخص بیک وقت کامیابی کے ساتھ بہت سے راستوں پر سفر کیسے کر سکتا ہے؟ اور انہوں نے یہ ہمیں کر کے دکھایا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی شعبے میں کسی نے اہم کارنامے انجام دیئے ہوں اور دنیا اُسے برگد کا پیڑ قرار دینے پر مجبور ہو تو ایسی شخصیت کے زیرِ سایہ پودے پروان نہیں چڑھتے لیکن یہ بات محترم صفدر ہمدانی نے غلط ثابت کر دی ہے۔ وہ ایک ایسے بڑے باپ کے فرزندِ ارجمند ہیں، جنھوں نے براڈ کاسٹنگ کی دنیا میں بھی صفِ اول کی شخصیات کی امامت کا اعزاز اپنے نام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہوا کے دوش پر جو پہلی آواز دور دور تک لوگوں تک پہنچی، وہ ہمارے صفدر ہمدانی صاحب کے والد بزرگوار محترم مصطفیٰ ہمدانی ہی کی تھی۔ 13 اور 14 اگست 1947 کی درمیانی رات 12 بجے انھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے پاکستان کے قیام اور غلامی سے آزادی کا اعلان کیا تھا۔ اسی کی بنیاد پر اپنے والد بزرگوار مصطفیٰ ہمدانی کو محترم صفدر ہمدانی نے بڑے خوبصورت انداز میں سلامی دی ہے۔

ہم مناتے ہیں جو یہ روز سعید
سچ تو یہ آزاد لوگوں کی ہے عید

قبر میں تا حشر صفدر اس کی نور
صبحِ آزادی کی دی جس نے نوید

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ محترم مصطفیٰ ہمدانی براڈ کاسٹنگ کے دنیا میں برگد کا ایک گھنا اور سایہ دار پیڑ تھے اور ایک ایسا پیڑ تھے، جس کے نیچے بہت سے تن آور پیڑ پروان چڑھے اور ان میں ایک نام محترم صفدر ہمدانی کا بھی ہے۔ وہ اپنے والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلے اور براڈ کاسٹنگ کی دنیا میں متعدد شاگرد پیدا کیے۔ انھوں نے پانچ برس تک ریڈیو پاکستان کی اکیڈمی میں نشریات کے طلبا کی تربیت کی اور اس دور میں ملک بھر میں ریڈیو پاکستان کے مراکز کے سربراہان کے شاگرد رہے جن میں سے بڑی تعداد اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔

صفدر ہمدانی نے نشریات و صحافت ہی میں نہیں، گلشنِ ادب میں بھی رنگ جمائے، خوشبو لٹائے اور فکر و خیال کی روشنی سے اذہان و قلوب کو جھلملاتے نظر آ رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی توانائیوں میں کمی نہیں آئی بلکہ ان کا سفر تیز تر ہو گیا ہے۔ بات ہو رہی ہے محترم صفدر ہمدانی کی لیکن ان کا مرتبہ جاننے کے لیے محترم مصطفیٰ ہمدانی کا مقام جانے بغیر بات ادھوری رہے گی۔ مجھے یاد ہے کہ ادبی تنظیم قافلے کے پڑاؤ میں معروف ٹی وی

کمپیئر طارق عزیز کو میرے والد گرامی سید فخرالدین بلے نے ٹی وی کا مصطفیٰ ہمدانی قرار دیا تھا اور ان ریمارکس پر طارق عزیز نے کہا تھا کہ آپ کا یہ کہنا میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔ جیسے ریڈیو پاکستان کی نشریات کے آغاز کا سہرا محترم مصطفیٰ ہمدانی کے سر ہے، بعینہٖ طارق عزیز نے پاکستان کی ٹی وی نشریات شروع کرنے کا اعزاز اپنے نام کیا تھا۔ بلاشبہ محترم صفدر ہمدانی برگد کے چھتنار پیڑ کے زیر سایہ پروان ضرور چڑھے ہیں لیکن اب خود ایک برگد کا چھتنار اور تناور پیڑ بنے ہوئے ہیں۔ ان کے سائے میں اَن گنت پودے پلے اور پروان چڑھے ہیں۔ وہ اپنے سائے میں بیٹھنے والوں کے قد بڑھتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ باصلاحیت نوجوانوں کی ہمت بندھاتے ہیں۔ ان کی فکری رہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اپنے عالمی اخبار کے صفحات کو انھوں نے ان مقاصد کے لیے بھی وقف کر رکھا ہے۔ یہ پھل دار پیڑ اور اعلیٰ ظرف انسان کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ محترم صفدر ہمدانی صاحب کی عاجزی اور انکساری دیکھ کر مجھے اپنے والد بزرگوار سید فخرالدین بلے کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

پیڑ نعمت بدست و سر خم ہے
ہے تفاخر بھی انکسار کے ساتھ

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے بہت کچھ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا اور ادب کا جہان ہو کر بھی خود کو ایک معمولی انسان اور طالب علم سمجھنا بھی ایک ایسا وصف ہے، جس نے محترم صفدر ہمدانی صاحب کی عظمت کو چار چاند لگا رکھے ہیں۔

محترم صفدر ہمدانی ایک منجھے ہوئے ادیب، دلوں کے تار ہلا دینے والے شاعر، مایۂ ناز اسکالر، حُبِ اہلِ بیتِ اطہار سے سرشار مرثیہ نگار، باریک بیں محقق، سحر طراز براڈ کاسٹر، دیدہ ور کالم نویس، آواز کی دنیا کے بے تاج بادشاہ، دل کے دروازوں پر دستک دینے والے صداکار، کئی دہائیوں سے سمندر پار مقیم رہنے کے باوجود پاکستانیت کے علم بردار، میر و سیاحت کے شوقین، انجمن آرائیوں کے رسیا، اسلامی اقدار و روایات کے پاسدار، نشریات اور ابلاغیات کے ماہر اور برطانیہ میں مملکتِ خداداد پاکستان کے غیر سرکاری اور غیر اعلانیہ سفیر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات میں اتنی دنیاؤں کو سمیٹے ہوئے ہیں کہ کسی ایک مختصر سے مضمون میں ان کے شخصی اوصاف، پیشہ ورانہ مہارت، فنکارانہ جہتوں اور گراں مایہ خدمات کا احاطہ آسان نہیں ہے۔

محترم صفدر ہمدانی نے براڈ کاسٹنگ، صداکاری، ابلاغیات، ادب، تصنیف و تالیف، مرثیہ نگاری، کالم نویسی اور سفرنامہ

نگاری کی دنیا میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور انہی کارناموں نے انہیں عالمی سطح پر شہرت و مقبولیت کی نئی رفعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔

محترم صفدر ہمدانی کی زندگی کی کہانی داتا کی نگری سے شروع ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا آفتاب لاہور ہی کے ایک معروف ادبی خانوادے میں 17 نومبر 1950 کو طلوع ہوا۔ شعور نے آنکھ کھولی تو فضاؤں میں درود و سلام کی گونج سنائی دی۔ پنجتن پاک کی محبت و عقیدت ورثے میں ملی تھی۔ گھر کے ماحول کی پاکیزگی نے اسے مزید جلا بخشی۔ یہ ایک ایسا بیج تھا جو ان کی زمین دل میں ان کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا اور ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی بڑھ کر ان کی طرح توانا ہوتا چلا گیا۔ تعلیم و تربیت کے تمام مراحل لاہور ہی میں طے کئے۔ ان کے ہاں جو والہانہ پن نظر آتا ہے، یہ لاہور کی فضاؤں کی دین ہے۔ وہ کل بھی لاہوری تھے اور برسوں لاہور سے دور رہنے کے باوجود آج بھی لاہوری ہیں۔

صفدر مری لاہور سے نسبت ہے عجب سی
میرے لیے یہ شہر مدینے کی طرح ہے

.....

ایف سی کالج، لاہور سے گرایجویشن کرنے کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ابلاغیات میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔

اپنے والد بزرگوار مصطفیٰ ہمدانی، خالو فارغ بخاری اور ماموں رضا ہمدانی سے ادب و صحافت کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ اسی لئے اسی سلسلے کو روزگار کا وسیلہ بنانے کی ٹھان لی۔ والد بزرگوار نے ریڈیو پاکستان لاہور سے نشریات کا آغاز کیا تھا اور محترم صفدر ہمدانی نے بھی اپنے رجحان اور میلان کے باعث 1974 میں ریڈیو پاکستان، لاہور ہی سے پروڈیوسر کی حیثیت سے وابستگی اختیار کر لی اور پنڈی، تراڑکھل اسلام آباد اور ریڈیو اکیڈمی میں خدمات سرانجام دیں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے، جب ریڈیو ایک نشریاتی ادارہ ہی نہیں تربیتی ادارہ بھی ہوا کرتا تھا۔ بڑی بڑی ادبی شخصیات کی ادبی و علمی سرگرمیوں کا مرکز یہی ریڈیو سٹیشن لاہور تھا۔ نامور شخصیات سے ملاقاتوں کا ایک بہانہ بھی ان کے ہاتھ آ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ پروفیشن جیسے انکی زندگی بن گیا۔

نشریات کی دنیا میں محترم صفدر ہمدانی نے اپنی آواز کا خوب جادو جگایا۔ اسکرپٹ رائیٹنگ کی بنیاد پر ارباب علم و ادب سے خوب داد سمیٹی۔ لاہور میں رہتے ہوئے بھی ہوا کے دوش پر ان کی آواز دیس دیس میں پہنچی اور یہ علم و عرفان کے دیپ جلاتے اور آگہی کی روشنی گھر گھر پہنچاتے رہے۔ یہ وہ ہستی ہیں، جنھیں کئی ممالک کے نشریاتی اداروں سے وابستگی کا اعزاز حاصل ہے۔

ان کے جنوں نے زندگی کے کسی بھی موڑ پر انھیں فارغ بیٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ سمندر پار بھی ابلاغیات اور نشریات کی دنیا ہی میں اپنے کمالات اور پیشہ ورانہ جوہر دکھاتے رہے۔ ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔ قریباً چار سال ریڈیو جاپان میں خدمات انجام دے کر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ محترم صفدر ہمدانی کے کیا کہنے۔ یہ دو دہائیوں تک بی بی سی اردو میں بھی اپنے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ اسی لئے جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی، سنی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں کے رہنے والے ان کے نام، کام اور کلام سے خوب آشنا ہیں اور آشنا ہی نہیں، بہت سے ملکوں میں ان کے چاہنے والے ان کے گُن گاتے نظر آتے ہیں۔ انھیں پاکستان سے ترکِ سکونت کئے 30 برس ہو چکے ہیں لیکن آج بھی اپنے وطنِ عزیز میں گزارا ہوا وقت ان کا گراں قدر اثاثہ ہے۔ آپ پورے مان کے ساتھ انھیں برطانیہ میں پاکستان کا خوبصورت چہرہ قرار دے سکتے ہیں۔ انھوں نے 1992 میں برطانیہ کو اپنا وطنِ ثانی بنایا تھا اور اب 2022 میں یہ دونوں ملکوں کے شہری ہیں لیکن وہاں رہتے ہوئے بھی ان کا دل پاکستانیوں کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ یہ مغرب کی چکاچوند روشنیوں میں بھی پاکستان کو نہیں بھولے اور ایسے راستے اپنائے کہ پاکستانیوں کی سرگرمیوں سے خود بھی آگاہ رہیں اور دیس دیس کے لوگوں کو ان کی سرگرمیوں کی خبر بھی دیتے رہیں۔ جی ہاں، آپ درست سمجھے ہیں۔ انھوں نے عالمی اخبار کا اجرا اسی لئے کیا تا کہ پاکستان اور پاکستانیوں کی خوبصورتیوں کی جھلک دنیا کو عالمی سطح پر دکھا سکیں۔ 2008 سے نیٹ پر یہ عالمی اخبار دستیاب ہے اور مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے محترم صفدر ہمدانی مستقل مزاجی کے ساتھ اسی ای اخبار کی بنیاد پر ضیافتِ طبع کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یہ وہ پلیٹ فارم ہے، جس کے ذریعے ہمارے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچایا جا رہا ہے اور مختلف شعبوں میں جو کارہائے نمایاں ہمارے پاکستانی انجام دے رہے ہیں، انہیں بھی اجاگر کیا جا رہا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں دنیا کو دکھائی جا رہی ہیں۔ اسی لئے یہ عالمی اخبار مقبولیت کے نئے ریکارڈ بنانے کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ اخبار اتنے برسوں سے کسی ایک پیسے کے اشتہار کے بغیر شائع بلاناغہ شائع ہوتا ہے۔

محترم صفدر ہمدانی نے تصنیف، تخلیق اور تالیف کی دنیا میں بھی بڑے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''کفن پہ تحریریں'' 1974 میں لاہور میں شائع ہوا تھا اور بعد ازاں مختلف

تصانیف کی اشاعت کے بعد2003 میں ان کی کتابیں ''فرات کے آنسو''... مرثیوں کا مجموعہ.....نورِ کربلاعزائی شاعری پہ تحقیق... اور''معجزہ قلم' رباعیات، قطعات و قصائد کا مجموعہ... فروری 2004 میں شائع ہوا جبکہ ان کی تالیف اور تدوین ''کلیات حسین'' حسن عباس زیدی (مرحوم) کی شاعری کی کلیات 2005 میں طبع ہوئی۔ اگست 2006 میں ان کا پہلا سفرنامہ ''تہران اور گرعالمِ مشرق کا جنیوا'' شائع ہوا۔2007 میں مرثیے کی دو کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے ایک ''زینت ہستی'' ماں کے موضوع پر لکھا ہوا مرثیہ ہے جبکہ دوسری ''عطائے رضا'' کے نام سے امام رضا علیہ السلام کا مرثیہ ہے۔ ''رو رہا ہے آسماں'' مرثیوں کا ایک اور مجموعہ اور غزلوں کے مجموعے'' بادل۔ چاند اور میں'' اور''گونگی آنکھیں'' زیرِ ترتیب ہے۔

جہان نعت کے نام سے نعتوں کا ایک انٹرنیٹ مجموعہ اردو ادب کی عالمی ویب سائٹ ریختہ پر بھی موجود ہے۔

صفدر ہمدانی کی شخصیت و فن پر تحقیقی مقالات بھی لکھے گئے۔

2012 میں ایجوکیشنل یونیورسٹی لاہور سے ایم اے آر بی ایڈ فائنل کی ایک طالبہ مس مصباح اعظم نے جناب ہمدانی صاحب کی معیاری اور دل سوز'' مرثیہ نگاری'' پر تحقیقی تھیسس لکھ کر کامیابی حاصل کی ہے یہ تھیسس ایک کتاب کی شکل میں چھپ چکی ہے۔

اس کے بعد سیدہ ثمر جعفری نے سیشن 2016-2018 میں اپنا ایم فل کا مقالہ بعنوان صفدر ہمدانی کی ادبی خدمات گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے مکمل کر کے کامیابی حاصل کی ہے۔

بات دور نکل سکتی ہے، اس لئے میں چاہوں گا کہ آپ محترم صفدر ہمدانی کے مناقب، سلام اور ان کی مرثیہ نگاری کی ایک جھلک دیکھ لیں، ان کا یہ کلام میں نے ان کی شاہکار کتابوں سے لیا ہے:

بازار شام روتا تھا بنت بتول کو
سجاد صاف کرتے تھے چہرے کی دھول کو
صفدر یہی وہ شام کی ہے سرزمیں جہاں
قیدی بنا کے لائے تھے آلِ رسول کو

بہتے ہوئے لہو کی ہے فریاد یا رسول
شہروں کے شہر ہو گئے برباد یا رسول
صفدر قسم خدا کی ہے اس ارضِ شام پر
انسانیت کی موت ہے امداد یا رسول

قاتل کو اپنے تخت سے ہے پیار آج بھی
ظالم حکومتوں کے ہیں سردار آج بھی
صفدر ہیں زندہ ظلم کی ساری گواہیاں
ہے شام میں یزید کا دربار آج بھی

ساری ملوکیت کا ازل سے ہے ایک کام
انکے ستم کا صرف ہدف اپنے ہی عوام
صفدر جو پوچھتا تھا کوئی ظلم کا مقام
سجاد رو کے کہتے تھے بس شام شام شام

.....

زندہ وفا کا نام ہے زینب کے نام سے
آگاہ اب بھی شام ہے زینب کے نام سے
مجلس کا اہتمام ہے زینب کے نام سے
یہ کربلا دوام ہے زینب کے نام سے
زینب کا ہر بیان ہے تفسیر کربلا
زینب کا امتیاز ہے تشہیرِ کربلا
(صفدر ہمدانی)

.....

بنت علی تسلسلِ کرب و بلا بنی
انسانیت کے ننگے سروں کی ردا بنی
زینب امیرِ قافلہء کربلا بنی
دربارِ شام میں وہ علی کی صدا بنی
دشمن ساعتوں میں زہر گھولتے رہے
زینب کے بازوؤں کے رسن بولتے رہے
(صفدر ہمدانی)

آیات میں جوں آیہء تطہیر ہے بلند
ایسے بلند بھائی سے ہمشیر ہے بلند
زینب تری دعا کی یہ تاثیر ہے کہ آج
قریہ بہ قریہ پرچم شبیر ہے بلند
(صفدر ہمدانی)

.....

کہنے کو یزیدوں کے تھی دربار کی ہیبت
تھی اس سے فزوں قافلہ سالار کی ہیبت
سجاد کے خطبے سے تھا ایوان پہ لرزہ
طاری ہوئی دربار پہ بیمار کی ہیبت
سر کاٹ کے دشمن کو سکوں مل نہیں پایا
نیزے پہ تھا سر اور تھی سردار کی ہیبت
سر پیٹتے تھے علقمہ کے دونوں کنارے
کچھ ایسی تھی پانی پہ علمدار کی ہیبت
اکبر کی بھی ہاں تیغ زنی ایسی تھی صفدر
کربل میں تھی جوں حیدر کرار کی ہیبت

.....

نوک قلم سے خون بہا جب کہا حسین
بادل برستا، پھول کی خوشبو، صبا حسین
ہونٹوں پہ تشنگی کی صداؤں کے بین تھے
دل کربلا کی سمت چلا جب لکھا حسین
سنتا تھا ذکر کرب و بلا ماں کے پیٹ میں
ماتم کا شور خوں میں اٹھا جب سُنا حسین
ہر ایک حرف سینہ زنی کر رہا تھا تب
قرطاس پر لہو سے جو تُو نے لکھ دیا حسین
شامل ہے کربلا میں ریاضت رسول کی
معراجِ مصطفیٰ تھی تری ابتدا حسین
لکھا ہوا فلک پہ ہے بابِ شہید پر
ہیں ابتدا علی و حسن ، انتہا حسین
تفسیر تیری ذات رہِ مستقیم کی
جنت کا راستہ ہے ترا راستہ حسین
ہوتی نہیں قبول کبھی جب دعا مری
دیتا ہوں میں خدا کو تیرا واسطہ حسین

[جاری ہے۔]

ناسخ (تنسیخِ منسوخ)

جہاں اردو شاعری چلی ہے وہاں مفروضہ سازی بھی چلی ہے کچھ من پسند حقائق کی بنیاد پر اردو شاعری کو اس وقت کی اردو شاعری کو دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جب شاعری میں ماحول کے تقاضے مختلف ہو گئے تھے۔ یہ دہلی کے اجڑنے اور لکھنؤ کے آباد ہونے کا زمانہ تھا، دہلی میں تنگ دستی اور بدحالی وبالِ جاں بنی ہوئی تھی اور لکھنؤ میں فارغ البالی اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ معاشی حالات کی تفریق اور مقامی اقدار نے شاعری کو بھی درجہ بہ درجہ نوعیتوں کے اختلاف سے دوچار کر دیا تھا۔ دہلی میں تصوف، درد وغم، احتیاط اور بلند خیالی ادب لحاظ نے رواج پایا جب لکھنؤ میں تکلّف، ابتذال بے احتیاطی اور کھل کر ہر قسم کی بات کرنے کا رجحان عام ہوا۔ دہلی کی شاعری گویا ''آہ'' تھی اور لکھنؤ کی ''واہ''۔ دہلی کی شاعری داخلیت کی آئینہ دار تھی اور لکھنؤ کی شاعری خارجیت کے اسباب کی واضح اور واضح۔ جو شاعر نامساعد حالات سے تنگ آ کر دہلی سے لکھنؤ چلے گئے وہ اپنے شعری اثرات ہم راہ لے گئے۔ دہلی کے دبستان شاعری کی ان شعروں سے عکاسی ہوتی ہے:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
(شیفتہ)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کی رگِ شیشہ گری میں

دیکھ تو دل سے کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

میر صاحب رلا گئے سب کو
کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے
(میر)

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

.....

غالب کی شعری ہمہ گیری عالمی سطح کی ہے غالب کے اشعار میں سائنسی تغزل بھی ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
(غالب)

آصف ثاقب

درد آتشِ قہر آفت ہے
اک بجلی سی آن پڑتی ہے
میرے احوال پہ نہ ہنس اتنا
یونہی اے مہربان پڑتی ہے
(درد)

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
(ذوق)

لکھنو کے دبستان شاعری کے باب میں ناسخ کی ''مثالیت'' برسرِ عام اس مزاجِ شعری کی پاسبانی میں ناسخ کو آگے رکھا گیا ہے چنانچہ ناسخ کا مقطع ہے:

لڑتے ہیں پریوں سے کشتی پہلوان عشق میں
ہم کو ناسخ راجا اندر کا اکھاڑہ چاہیے

.....

لکھنویت کے تناظر میں امانت کا مطلع دیکھیے:

بے پردہ گئے لگاوٹ کے دھیان میں
بھبھیں گلوریاں مجھے انگیا کے پان میں

اور وزیر کا شعر:

ادا سے جھک کے ملتے ہو، نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو ناوک لگاتے ہو کماں ہو کر

پھر ناسخ:

چشم بددور آج آتے ہیں نظر کیا صاف گال
سبز کا خط کیا غزال چشم کا چارہ بنا

مگر دہلویت کے شیفتہ کہتے ہیں:

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ لفظ خوش انداز صاف ہو

.....

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ مصحفی کے ایسے پر درد شاعر بھی لکھنویت کا دم بھرتے ہیں۔ مصحفی کہتے ہیں:

بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا
پانی سے نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

ترے کوچے ہر بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

.....

لکھنویت نے بھی دہلویت کی صورت پر پرزے نکال رکھے ہیں۔ بہت سی مثالیں ہیں۔ دو اور نمائندہ مثالیں:

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو
نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل
(بحر)

نتھ کے موتی پکارتے ہیں پڑے
تیرے عاشق کے ناک میں دم ہے
(سوز)

جب مصحفی کا یہ شعر لفظ و اظہار میں دہلی کی قسم کھاتا ہے:

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں یہ قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

.....

دہلی کے دبستان شاعری میں بندشیں اور فنی استدراک شعریت کے بڑے علاقے کو محیط ہے یہ اور بات ہے کہ ناسخ زبان و بیاں کی نوک پلک سنوارنے میں بڑا اسم رکھتے ہیں۔ انھیں شدت احساس سے بعید قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے کئی شعر حسنِ بیاں درد و غم

سادگی اور پُرکاری میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ ناسخ کے ان اشعار کے بل بوتے پر ان پر وارد کی گئی شعری تنقیدی تنسیخ کو منسوخ کیا جا سکتا ہے اس طرح دبستانوں کا مفروضہ معرضِ نظر میں پڑ جاتا ہے۔ سید عابد علی عابد نے اپنے ایک مضمون میں دبستانوں کے اس مفروضے کی نفی کی ہے اسے ایک غلط فہمی ٹھہرایا ہے۔ اگرچہ درس و تدریس میں اس ذوق و شوق سے برتا جا رہا ہے، ہر نوع دونوں دبستانوں کی شاعری تردیدی امکانات سے صرف نظر کر کے دیکھی جائے تو بے شمار تائیدی اعتقادات ہاتھ آئیں گے۔ اس سلسلے میں ناسخ کی شدتِ احساس کی شاعری سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ناسخ کا حسنِ تغزل:

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

آتی جاتی ہے جا بجا بدلی
ساقیا جلد آ ہوا بدلی

پوچھ اے ناسخ نہ کچھ میری اداسی کا سبب
آپ میں دن رات حیراں ہوں ہوا ہے کیا مجھے

عشق کو کس کے دل سے لاگ نہیں
کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

بات جن نازک مزاجوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی
بوجھ اُن سے سینکڑوں من خاک کا کیونکر اٹھا

مثنوی کی بحر میں یہ کلام:

اس ابر میں یار سے جدا ہوں
بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

امید وصال اب کہاں ہے
اس گل سے برنگ بُو جدا ہوں

آئینہ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

ہے مہر و وفا سراسر اس میں
ناسخ کیونکر اسے نہ چاہوں

.....

ناسخ کی رباعی:

سیلاب رواں ہے چشم تر سے ہر دم
سوتے نہیں اک آن شبِ ہجر میں ہم
کس طرح پلک پلک سے لگ جائے کبھی
ملتے نہیں دریا کے کنارے باہم

.....

غالب کے سے بڑے شاعر نے ناسخ کو بہ نظرِ پسند دیکھا اور بات کہی۔ وہی بات "بقولِ ناسخ" اور "مقتدِ میر" والی بات۔ ناسخ کے "رثائی شعر" بہت قیمتی ہیں۔ پڑھو اور آنسو آنسو ہو جاؤ۔

☆☆☆☆☆

اقبال اور اشتراکیت

اشتراکیت جو بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے رد طور پر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے چہار دانگ عالم میں اس کی شہرت پھیل گئی، سرمایہ دار جو محنت کش اور مزدور کے استحصال اور نادار طبقہ کی تذلیل کو اپنا حق سمجھتا ہے اشتراکیت نے اس کے خلاف آواز بلند کی جو مشرق تا مغرب ہر مزدور، غریب اور محنت کش کی آواز بن گئی۔

اقبال نے بھی نظام اشتراکیت کو اسلامی اصولوں کے مطابق پرکھا اور اسے نظام سرمایہ داری کے خلاف آواز حق قرار دیتے ہوئے اس کی حمایت کی۔ لیکن اس حقیقت سے کامل آگاہی کی اشد ضرورت ہے کہ اقبال نے اشتراکی نظام کو سرمایہ داری کے رد کے طور پر قبول کیا نہ کہ بطور ایک معاشی نظام۔

جو لوگ اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اقبال اشتراکیت کے حامی ہیں انہیں اس بات سے روشناس کروانا ضروری ہے کہ اقبال نے اشتراکیت کو ایک نئے فتنے سے تعبیر کیا۔ اقبال رقم طراز ہیں:

من از حلالِ چلیپا دگرنہ اندیشم
کہ فتنۂ دگرے در ضمیرِ ایام است[1]

ترجمہ: ”مجھے ہلال (اسلام) و صلیب (عیسائیت) کی چپقلش سے سوائے اس کے اور کوئی خوف نہیں ہے کہ ان دونوں کی چپقلش سے دنیا میں کوئی نیا فتنہ نہ نمودار ہو جاؤ (اگر یہ دونوں قومیں آپس میں دست و گریبان رہیں گی تو اشتراکیت کی صورت میں کوئی نئی قوت ابھر سکتی ہے)“

اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے کھلے لفظوں میں اشتراکی نظامِ معیشت کو ایک نیا فتنہ کہہ کر متعارف کروایا۔ اقبال کی نظر میں اشتراکیت بطور ردِعمل ایک مضبوط اور بڑا فتنہ تھا لیکن بطور نظام ایک کمزور اور مصنوعی فکر کا حامل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ نظام سرمایہ داری نے اپنی مضبوط فکری بنیادوں کے سبب جاگیرداری کو شکست دی لیکن اشتراکیت کو وہ مضبوط فکری بنیادیں نہ مل سکیں جو سرمایہ داری کو مکمل خاتمہ سے دوچار کر سکیں۔ اشتراکیت نے سرمایہ داری کو رد کیا اور اس کے خلاف آواز اٹھائی لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی

فرح نادر

جڑیں اتنی مضبوط تھیں جنھیں ختم کرنا نومولود نظامِ اشتراکیت کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس سے لڑنے کے لیے مضبوط فکری بنیادوں پر دلالت کرنے والے اصولوں کی ضرورت تھی جو فی الوقت اشتراکی نظام کے پاس قطعاً موجود نہ تھے۔ اقبال نے اشتراکیت کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ اسلامی نظامِ معیشت سے اخذ کردہ اصولوں کی روشنی میں اس کا مکمل جائزہ لے کر اس میں موجود کمزور پہلوؤں کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ اس کی خوبیوں اور خامیوں پر برملا تنقید بھی کی۔ اشتراکی نظامِ معیشت مکمل طور پر کبھی ردوقبول کی منازل طے نہ کر سکا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی ناکامی کے بعد ایک مخلوط نظامِ معیشت کی ابتدا ہوئی جسے قریب دنیا کے تمام ممالک میں اس وقت قبول عام حاصل ہے۔ اقبال مسلمانوں کو اس نئے نظام کی خامیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کی تلقین کرتے رہے۔ جب اشتراکیت نے سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لیکر اس نظام کو اپنے انجام کو پہنچایا اور اشتراکیت کو قبولِ عام حاصل ہوا تو اقبال نے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے اس نئے نظام کے خلاف صف آرا ہونے کی تلقین کی۔

لکھتے ہیں:

مسلمِ خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق، گرمِ تقاضا تو بھی ہو (۲)

'بانگِ درا' کی بیشتر نظموں اور پیامِ مشرق کی اشاعت کے بعد اشتراکی نظریات کے حامل انقلابی، ترقی پسند (جنھیں بائیں بازو کے دانشور کہا جاتا ہے) ادبا نے اقبال کو زبردست اشتراکی اور ترقی پسند سمجھنا اور پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں اس وقت کے اہم اور بااثر اخبارات و رسائل اور ان کے مدیر پیش پیش رہے۔ اقبال کی نظم 'خضرِ راہ' اور 'پیامِ مشرق' پر بالشویک خیالات کے غلبہ کا الزام لگایا گیا۔ آخر کار اقبال نے روزنامہ 'زمیندار، لاہور' کے توسط سے اس کی تردید کی اور اپنا موقف واضح کیا اور مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کو راہِ نجات قرار دیتے ہوئے اعتدال کا راستہ اپنانے پر زور دیا اور نظامِ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو معاشی اور معاشرتی تباہی کا شاخسانہ قرار دیا اور نظامِ اشتراکیت کے متعلق اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کیا:

''میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے۔

میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے اگر آپ پورے غور اور توجہ سے مطالعہ کریں تو ممکن ہے آپ انہی نتائج تک پہنچ جائیں جن تک میں پہنچا ہوں۔ اس صورتِ حال میں غالباً آپ کے شکوک تمام کے تمام رفع ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا (View) مجھ سے مختلف ہو یا آپ دینِ اسلام کے حقائق کو ہی ناقص تصور کریں۔ اس دوسری صورت میں دوستانہ بحث ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔"(۲)

موجودہ دور میں بھی بہت سے ایسے دانشور اور ادیب جو اقبال کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکے، انہیں اشتراکی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں قابلِ ذکر نام سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے کا ہے۔ حنیف رامے نے اپنی کتاب جو 'اقبال اور سوشلزم' کے نام سے موسوم ہے میں اقبال کو کٹر سوشلسٹ نظریات کا حامی قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش آج نہیں کی گئی بلکہ اقبال کے عہد سے تا حال جاری ہے، جن کا اقبال اپنی زندگی میں گاہے گاہے جواب دیتے رہے۔ ایک صحافی نے ۲۳ جون، ۱۹۲۳ کے 'زمیندار' میں ایک مضمون شائع کروایا جس میں آپ پر سوشلسٹ ہونے کا الزام لگایا گیا جس کے جواب میں آپ نے اگلے ہی دن اسی اخبار میں جوابی مضمون شائع کروایا۔ لکھتے ہیں:

"میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے گئے ہیں چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر ثمرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس وقت مناسب حدود میں رکھنے کے لیے قانونِ میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔ مغرب کا سرمایہ داری نظام اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت پر غالب نہ آ جائے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس سے سرمایہ داری

اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول یا تو خالص اسلامی ہوں گی یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔" (۴)

اقبال پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام جیسے مضبوط فکری بنیادوں پر قائم نظام کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اقبال اشتراکی نظامِ معیشت کو بہر طور سرمایہ دارانہ نظام سے بہتر نظام خیال کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پر مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار (۵)

درج بالا اشعار اور اس جیسے کئی دوسرے اشعار جو اقبال نے اشتراکی معیشت کے حوالے سے کہے یہ ثابت کرنے کے لیے کم نہ تھے کہ اقبال سوشلسٹ نظریات کے شدید حامی ہیں لیکن اقبال اپنی بات کو یہیں ختم نہیں کرتے وہ اشتراکیت کی حمایت ضرور کرتے ہیں، اسے صدیوں پر محیط ظلم و جبر کی چکی کے پاٹ کو ریزہ ریزہ کرنے والا نظام ضرور سمجھتے ہیں لیکن اسے ایک انسان دوست نظام نہیں کہتے۔ جہاں ابلیس کی مجلس شوریٰ میں اقبال کارل مارکس کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں:

وہ کلیمِ بے تجلی وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب (۶)

وہیں یہ بھی لکھتے ہیں:

وہ یہودی فتنہ گر وہ روحِ مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے جس کے جنوں سے تار تار
زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہم سرِ شاہین و چرخ
کتنی سُرعت سے بدلتا مزاجِ روزگار (۷)

اقبال نے کارل مارکس کو جہاں کلیمِ بے تجلی، مسیحِ بے صلیب اور بغیر پیغمبری کے کتاب رکھنے والا کہا وہیں اسے یہودی فتنہ گر اور مزدک بامدادان (جو قبل از اسلام ایک فلسفی گزرا، اسی کا فلسفہ تھا جو اس کی وفات کے بعد مزدکیت کے نام سے مشہور ہوا بعد ازاں یہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا) کی فکر کا علمبردار کہہ کر مخاطب کیا۔ یہ نظامِ فکر ناکامی سے دوچار ہوا (اس لیے ابلیس اسے اپنے قبیلے کے لیے زیادہ خطرناک نہیں سمجھتا) یعنی اقبال نے کارل مارکس اور اس کے فلسفے میں موجود کمزوری کی طرف اشارہ کیا اور اسے سرمایہ دارانہ نظام جیسے مضبوط نظام کے سامنے ایک وقتی اٹھان

رکھنے والی فکر قرار دیا جو جزوقتی عروج سے دوچار ہوئی اور وقتی غبار کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے چھا گئی۔

اقبال نے اشتراکیت کو "زاغ دشتی" کمزور صحرائی کوّے سے تشبیہ دی اور یہودی اور عیسائی سازشوں کی طرف اشارہ کیا۔ جس طرح ان کی تحریف شدہ کتابیں دنیا میں فتنہ وفساد کا باعث ہیں عین اسی طرح اقبال اشتراکی فکر وفلسفہ پر مبنی کتاب 'سرمایہ' Das Capital' (جو کارل مارکس نے لکھی) کو وہ فتنہ قرار دیتے ہیں، جس سے موجود تمام فتنے فنا ہو جائیں گے۔ ابھی تک دنیا میں موجود کسی بھی بڑے نظام نے اشتراکیت کو خاطر خواہ اہمیت نہ دی تھی اور نہ اس کی اس فتنہ انگیزی کو محسوس کیا تھا جو دراصل بڑی ہلاکت خیزی کا باعث بن سکتا تھا۔ کارل مارکس کو مزدکی صفات کا حامل بتایا اور اشتراکی فلسفہ کو زمین پر فتنہ وفساد کا موجب قرار دیا۔ سرمایہ داروں نے اشتراکیت کو ہرگز اپنے لیے کوئی بڑا خطرہ قرار نہ دیا یہی وجہ ہے کہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں ابلیس کے مشیروں کے اصرار پر بھی ابلیس نے جواب میں:

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے[8]

اقبال چونکہ اشتراکی نظامِ معیشت کی تمام فتنہ انگیزی اور ہلاکت خیزی کے باوجود اس کی کمزور پالیسیوں اور بے اعتدالیوں کو بھانپ چکے تھے لہٰذا ابلیس کے نظامِ فکر (سرمایہ داری و جاگیرداری) کے سامنے اشتراکیت کو کوچہ گرد سے واضح کیا۔ یہ اقبال کی دوراندیشی، معاملہ فہمی اور مستقبل شناسی ہی تھی جس نے اشتراکی نظام میں موجود خامی کو اس کے لیے خطرے کی سب سے بڑی گھنٹی قرار دیا لیکن ساتھ ہی مستقبل میں اپنی بقا کے لیے اسے نعرۂ 'لا' سے 'الا' کی طرف سفر کا مشورہ بھی دیا۔ لکھتے ہیں:

لادینی و لاطینی، کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لا غالبُ الا ھُو
صیادِ معانی کو یورپ سے ہے نومیدی
دلکش ہے فضا لیکن بے نافہ تمام آہو[9]

اقبال اس حقیقت سے کلی طور پر آگاہ تھے کہ مشرقی عوام کی فلاح و بقا صرف اور صرف قرآنی تعلیمات ہیں، نہ ہی سرمایہ داری انسانیت کو تحفظ دے سکی اور نہ اشتراکیت مساوات قائم کر سکے گی۔ اقبال اپنی دوراندیشی سے بھانپ چکے تھے کہ مغرب سے اٹھنے والی تہذیبی و استعماری یلغار مشرق کی صدیوں پرانی تہذیب کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے گی۔ شیطانی طاقتوں کا مغربی کلچر کے روپ میں ظہور، مشرقی اقوام کے لیے سب سے

بڑا خطرہ تھا جو انھیں مذہبی، سیاسی، معاشرتی و معاشی ہر طرح سے مغلوب کر دینے کے درپے تھیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں اس کی جو تصویر کشی کی گئی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اشتراکی کوچہ گردوں کا اصولِ مساوات صرف اور صرف نعروں کی حد تک تھا۔ اصلیت میں صورتِ حال بالکل اس کے برعکس رہی۔ جب کہ اسلام نے مکمل نظام معیشت پیش کیا ہے جو عدل و انصاف اور معاشی مساوات پر دلالت کرتا ہے جس کے حوالے پچھلے ابواب میں دیے گئے ہیں۔ اقبال اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں[10]

اقبال پر اشتراکی ہونے کا الزام اسی وجہ سے لگایا جاتا رہا ہے کہ اقبال کے بیشتر اشعار اشتراکی فلسفہ کی تائید کی اور توضیح و تفہیم میں ایک گائیڈ کا کام دیتے ہیں۔ اس سے آسان الفاظ میں سرمایہ داری و اشتراکیت کی تفہیم نہ ہو سکتی تھی جیسے اقبال نے کی۔ لکھتے ہیں:

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشت غبار
فتنہ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جویبار[11]

ایسے کئی اشعار جو مثال کے طور پر یہاں پیش کیے جا سکتے ہیں اقبال کو اشتراکی ثابت کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے اخبار 'زمیندار' میں جو مضمون شائع ہوا اس کے ایڈیٹر شمس الدین لکھتے ہیں:

''پیامِ مشرق میں قسمت نامۂ سرمایہ و مزدور اور نوائے وقت کے عنوان سے جو مختصر نظمیں لکھی ہیں ان سے قطع نظر کر کے صفحہ نمبر ۱۵۶ کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست[12]

ترجمہ: ''تیر، نیزے خنجر اور شمشیر کی مجھے آرزو ہے میرے ساتھ آؤ مجھے حسین کے مسلک کی آرزو ہے۔''

کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی ہیں تھے۔ ایسے تمام دانشور جنھوں نے اقبال کے کلام کا سیاق و سباق کے بغیر مطالعہ کیا ہے انھوں نے اقبال کے ایسے اشعار جو کارل مارکس اور اس کے پیش کردہ فلسفے کی توضیح میں مدد دیتے تھے اور جو سرمایہ و مزدور، روس، مارکس، لینن اور اشتراکیت کے حق میں تھے

انھیں بنیاد بنا کر اقبال کو اشتراکی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ خضرِ راہ میں اقبال کے وہ اشعار جہاں سرمایہ داری کی مخالفت کی گئی ہے۔ انہیں اشتراکی ذہنیت رکھنے والے دانشوروں نے اپنے مقاصد کے لیے بھرپور استعمال کیا۔

بالِ جبریل کی نظمیں سرمایہ داری سے شدید تلخی، نفرت اور اس کے لیے عدم برداشت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ نفرت، تلخی اور عدم برداشت ان عمومی بے انصافیوں، غیر انسانی اور غیر منصفانہ رویوں کی بدولت پیدا ہوئی جن پر نظام سرمایہ دارانہ کی عمارت کھڑی کی گئی، جنھیں اقبال نے بالِ جبریل کی نظموں میں کھل کر بیان کیا۔ اس سب صورت حال سے چھٹکارا حاصل کرنے اور اس صدیوں پرانے، فرسودہ نظام سے نمٹنے اور اس کا سدباب کرنے میں اشتراکی نظامِ فکر نے جو کردار ادا کیا اقبال نے کھلم کھلا اس کی تائید کی اور کارل مارکس اور لینن کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ جب اقبال لکھتے ہیں:

آج آنکھ نے دیکھا تو یہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات[13]

یہی نہیں اقبال کارل مارکس کو کلیم بے تجلی اور مسیحِ بے صلیب کے ساتھ ساتھ پیغمبرِ حق ناشناس اور پیغمبرِ بے جبرئیل کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل اُو مضمر است
قلب او مومن، دماغش کافر است[14]

ترجمہ: ''(صاحب سرمایہ، کتاب سرمایہ کا مصنف، جرمنی کا مشہور ماہر اقتصادیات) ابراہیم خلیل اللہ کی نسل سے ایک یہودی کارل مارکس جو کتاب ''سرمایہ'' کا مصنف ہے گویا بغیر جبریل کے ایک پیغمبر ہے''

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں نظام سرمایہ داری و اشتراکیت کی جو باہمی چپقلش اور اختلافی نکات بیان کیے گئے اس میں تیسرے مشیر کا بیان انتہائی دلچسپ ہے۔ کہتا ہے:

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب
میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے حجاب[15]

ان اشعار کی خصوصیت اس سے سوا ہے کہ اقبال نے اشتراکی نظامِ معیشت کو کس حد تک قبول کیا لیکن ماہرینِ اقبال جنھوں نے کلامِ اقبال کو تمام سیاق و سباق سامنے رکھتے ہوئے مطالعہ کیا وہ اس بات کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اقبال نے ابلیس کا موقف جن الفاظ میں واضح کیا وہ اس قدر پختہ اور مدلل ہے کہ اشتراکی نظامِ معیشت کی

تمام تر بیت فنا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو(۱۶)

پھر اسی رو میں بہتے ہوئے ابلیس پانچویں مشیر کے بیان کے جواب میں پے در پے اپنی غارت گری کی داستان رقم کرتے ہوئے کہتا ہے:

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کے سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مُو(۱۷)

یہاں پر ابلیس کے پیرو یعنی یورپی امرا اور سرمایہ دار طبقہ ہیں، جب کہ اشتراکی فلسفی اور ان کے پیروکار، سرمایہ داروں کے سامنے کوچہ گرد ہیں یعنی گلی محلے میں پھیری لگانے والوں کی طرح غیر مستقل، آج ہیں کل نہیں ہوں گے۔ یہ وضاحت ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں کی گئی یہی اقبال کی اشتراکیت کے بارے میں اصل اور مدلل رائے ہے۔ وہ اس کی تابناکی اور غارت گری کے قائل تھے مگر اس کے استقلال اور استحکام کے نہیں۔ اقبال کے نزدیک اصلی اور کامل نظامِ معیشت اسلامی نظامِ معیشت ہی ہے۔ جس خدشہ کا اظہار آخر میں ابلیس نے اپنے تمام مشیروں کے سامنے کیا وہ اسلام ہی ہے۔ وہ اشتراکیت کو محض ایک وقتی گرد و غبار سمجھتے ہیں۔ اشتراکی نظام کی لادینی فکر اور بے راہ روی پر اقبال نے شدید الفاظ میں مذمت کی۔ زبورِ عجم میں اشتراکیت اور مغربی استعماریت کے خلاف جہاد کی ترغیب دیتے ہیں اور مغربی استعماریت کے متعلق زبورِ عجم کے عشقیہ اسرار و رموز میں یوں بیان کرتے ہیں:

کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا را
ہزار فتنہ ازاں چشمِ نیم باز آور(۱۸)

ترجمہ: ''(اے خدا) آتش پرستوں کے مندر، مسلمانوں کے حرم کعبہ کافروں کے صنم خانے اور عیسائیوں کے گرجوں اپنی مستی بھری نگاہوں سے اگنت فتنے پیدا کر دے جو انھیں اپنے اپنے مذاہب سے سچی لگن اور محبت کے اصول پھر سے سکھا دے (لوگ جو دین سے پھر چکے ہیں انہیں دین کی طرف راغب فرما دے)''

اشتراکی نظامِ معیشت وہ مشتِ غبار تھی جو بلا کی تیزی سے اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے چہار دانگ عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو نظم 'خضرِ راہ' میں خضر نے شاعر کی یوں رہنمائی کی، ملاحظہ ہو:

کھول کر آنکھیں مرے آئینِ گفتار کی
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تعبیر دیکھ[19]

مسجدِ قرطبہ میں اقبال نے ثقافتی حوالے پیش کرتے ہوئے جب مسلم عرب حجازی رنگِ ثقافت تک پیش قدمی کی تو جدید تہذیبی اور استعماری قوتوں کی موجودہ صورت سامنے آئی اور پسِ آئینہ ایک تصور بازیافت میں انجام پایا۔ گو مسجدِ قرطبہ معاشی پیغام پر مشتمل نظم نہیں لیکن وقت اور حالات کے اتار چڑھاؤ کی جو مثالی تصویر اقبال نے مسجدِ قرطبہ میں پیش کی اس میں یہ ممکن نہ تھا کہ اقبال نظامِ سرمایہ داری کی شکست و ریخت کے بعد اشتراکی نظام کی ناکامی کا تذکرہ نہ کرتے۔ لکھتے ہیں:

حرفِ غلط بن گئی عظمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں[20]

یہ مسجدِ قرطبہ کا تقریباً اختتام ہے، مسجدِ قرطبہ اول سے آخر تک جوں جوں آگے بڑھتی ہے اقبال نئے رازوں سے پردے سرکاتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ درج بالا اشعار میں روسی اشتراکیت کی اصلیت کا پردہ چاک کیا جہاں اس کی انقلابی روح نے عیسائیت کی روح قبض کر لی تھی۔ اشتراکیت کی یہ انقلابی روح اس کا نعرۂ 'لا' تھا جس نے عیسائیت جسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہ دے پائی تھی اس کی جڑیں ہلا دیں تھیں۔ اشتراکی نظام بالخصوص روسی اشتراکیت کے نعرۂ 'لا' نے عیسائیت کے بت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اشتراکیت سے کئی ایک اختلافات کے باوجود اسے تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اشتراکیت کے لیے اقبال کے دل میں جو نرم گوشہ تھا اس کے دو واضح اسباب تھے۔

۱۔ اشتراکی نظام معیشت کے بنیادی اصول اسلامی معاشی نظام کے اصولوں سے مماثل تھے۔
۲۔ اشتراکیت نے صدیوں پرانے ظلم اور بربریت پر مبنی نظام کا خاتمہ کر دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جاوید نامہ میں جب جمال الدین افغانی کی زبانی اشتراکیت پر تنقید کی گئی تو بہرحال اس میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحسین و آفرین بھی موجود تھی۔ آپ لکھتے ہیں:

غربیاں گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک
جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس[21]

اقبال نے اپنے عہد میں موجود معاشی نظریات کے ساتھ ساتھ اشتراکی نظام معیشت کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اشتراکیت اور اس سے پہلے موجود تمام معاشی افکار کا اسلامی معاشی فکر سے موازنہ کیا۔ انھوں نے ان معاشی نظاموں کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کا اسلام سے تقابل کیا اور ان میں موجود خامیوں اور خوبیوں کو عوام الناس کے سامنے پیش کیا۔ یہ اقبال کے ذاتی افکار یا اختلاف و رغبت کے نتائج ہرگز نہیں تھے بلکہ اقبال نے ایک غیر جانبدارانہ اور منصفانہ روش اختیار کرتے ہوئے ان معاشی افکار میں موجود خامیوں پر کھلے لفظوں میں تنقید کی اور خوبیوں کو سراہا، سرمایہ دارانہ نظام چونکہ کلی طور پر غیر منصفانہ اور جابرانہ طرز حکومت و معیشت ہے لہٰذا اقبال نے ہر طرح سے اس نظام کی مذمت کی اور انسانی فلاح کے لیے اسے ایک بڑا خطرہ قرار دیا البتہ اشتراکیت کے بارے میں اقبال کا نقطہ نظر مختلف تھا کیونکہ اشتراکیت نے وہ تمام بنیادی اصول جن میں انسانی جذبات و احساسات کی بے حرمتی اور عوام الناس کی تباہی کا عنصر موجود تھا، ان سب سے انحراف کیا۔ چونکہ یہی بنیادی تعلیمات قرآن کی ہیں اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت کے بنیادی اصول قرآن کریم سے یا تو اخذ کردہ ہیں یا مماثل ہیں۔ یہی ایک نکتہ ہے جس پر اقبال اشتراکیت کی حمایت کرتے ہیں لہٰذا ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے کلی طور پر اشتراکیت کو رد نہیں کیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے اقبال نے اسے مکمل طور پر قبول کیا ہو۔ جہاں تک اشتراکی نظام نے اسلامی معاشی افکار کا اتباع کیا وہاں تک اقبال اسے نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس کی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو (۲۲)

اقبال یکسانیت سے بیزار فلسفی اور مفکر تھے صدیوں پرانا فرسودہ نظام جو انسانیت کی فلاح و ترقی میں کسی مثبت قدم کے بجائے منفی رجحان رکھتا ہو اقبال کیسے اس کی حمایت کر سکتے تھے۔ بطور ایک جدت پسند فلسفی ان کی اولین ترجیح یہی ہو سکتی تھی کہ ایک ایسا نظام جو فرسودہ نظاموں کو شکست دے کر ان کی جگہ لے لے اس کی حمایت کی جائے اور انھوں نے یہی کیا۔ جب اشتراکیت نے سرمایہ داری کو شکست دی اور مزدور اور پسے ہوئے غلام طبقہ کے حق میں نعرہ بلند کیا تو اقبال نے اسے ان لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا:

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات[۲۳]

درج بالا تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال نے مغربی تہذیب، علوم اور نظام ہائے معیشت کا گہرائی سے مطالعہ کیا، مغربی معیشت، سیاست اور معاشرت کو قریب سے دیکھا، جانچا اور پرکھا۔ اس تمام تحقیق کا قرآنی و اسلامی معاشی نظریات سے تقابل کیا اور اس تمام تر تحقیق، علم اور تجربہ کے نتائج کو اپنی نثر اور نظم میں امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کر دیا۔ تمام تر بحث میں اقبال کی نظم و نثر سے جو حوالہ جات شامل کیے گئے ہیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اقبال نے کبھی بھی مغربی معاشرت معیشت اور سیاست کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار نہیں دیا بلکہ مغربی نظام ہائے فکر کے وہ تمام پہلو جو اسلام سے مماثلت رکھتے تھے انہیں سراہا اور جہاں یہ نظامِ فکر اسلام سے میل نہیں کھاتا تھا اس کی دل کھول کر مخالفت کی۔

اقبال نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت فکر، فلسفہ اور علم و تحقیق میں صرف کیا اور یورپ، جرمنی اور بہت سے دوسرے ممالک میں قیام کیا، اس قیام کے دوران اقبال نے مغربی مفکرین و محققین کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ اقبال کارل مارکس کے نظریات یا اس کے فکر و فلسفہ سے لاعلم رہے، اچنبھے کی بات ہوگی۔ اقبال جیسا انقلابی فکر رکھنے والا دانشور اپنے ماضی اور حال دونوں سے بے خبر ہو یہ ناممکن سی بات ہے۔ اقبال یقیناً اپنے معاصر فکر و فلسفہ سے بخوبی واقف تھے اور گہری تحقیق، علم اور چھان بین کے بعد ہی انھوں نے معیشت جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ برصغیر میں اس موضوع پر لکھنے والوں میں اقبال کو اولیت حاصل ہے۔ ۱۹۰۵ کے بعد کی معاشی اور سیاسی کشمکش نے دنیا کو جس انقلابی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا، یقینی تھا کہ اقبال جیسا منطقی ذہن رکھنے والا انسان اس طرف راغب ہو اور یہی ہوا۔ ابتدائی شاعری کو چھوڑ کر بقیہ کلام میں کارل مارکس، لینن، سرمایہ دار اور سرمایہ داری، اشتراکیت، مزدور، کوہکن، ملوکیت اور اسی موضوع سے مطابقت رکھنے والے دوسرے الفاظ اور موضوعات اقبال کی شعر و نثر میں خصوصیت سے شامل ہیں۔ اقبال انقلاب روس اور اس کے وقتی اثرات ہی نہیں آئندہ مستقبل پر اس کے اثرات جو ظاہر ہونے والے تھے اس سے بھی شناسائی رکھتے تھے لہٰذا اقبال نے اپنی قوم بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنی معاشی حیثیت مستحکم کرنے کی بھرپور تلقین کی۔

اقبال نے انقلابِ روس کی تمام تر صورت حال سے جو اخذ کیا اسے پیامِ مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ اور بالخصوص مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں تفصیلاً بیان کر دیا۔ بانگ درا میں اقبال نے اس سیم تعلق افکار پیش کیے۔ نظم 'خضرِ راہ' میں سرمایہ و محنت اور جمہوری نظام سے متعلق اقبال کی رائے واضح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے۔

اقبال کا فلسفہ، شاعری، نثر حتیٰ کہ ان کی تمام فکر صرف اور صرف روحانی اور جسمانی تخلیقی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش ہے۔ وہ ہر اس نظام سے خبردار کرتے ہیں جو اسلامی نظامِ فکر کے مخالف فکر کا حامل ہے۔ اقبال نے اسلامی روایات کی مکمل توضیح اپنے فکر و فلسفہ میں بیان کی اور اسلامی فکر کو دلائل کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے کھول کر پیش کیا۔ خضرِ راہ سرمایہ و محنت، لینن خدا کے حضور، اشتراکیت و ملوکیت، کارل مارکس کی آواز، فرمان خدا، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، اشتراکیت، طلوع اسلام، جبریل و ابلیس، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خطاب بہ جوانانِ اسلام، شاہین اور اس کے ساتھ دیگر کئی نظمیں بھی اقبال کے معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر کی وضاحت میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور پرتگال اور دوسرے یورپی ممالک نے استعماری تہذیب کی بنیاد رکھی اور اپنی حریص نظریں ان غریب ممالک کی دولت پر مرکوز کر لیں جو معاشی طور پر کمزور اور غیر مستحکم تھے۔ یورپ نے ایشیا اور افریقہ کے تمام مسلمان ممالک کو اپنا ہدف بنایا اور ان کے تمام ذرائع پیداوار پر تسلط حاصل کر لیا۔ یورپ کے اس غیر منصفانہ اور جارحانہ رویے پر اقبال نے صدائے احتجاج بلند کی اور مشرقی اقوام کی آواز بن کر نہ صرف یہ کہ ان کی نمائندگی کی بلکہ انہیں غفلت کی نیند سے بیدار کر کے اصلیت اور حقیقت سے شناسائی بھی بخشی۔ اقبال نے جنگ عظیم اول اور اس کے بعد کے پر آشوب دور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے نتائج پر مسلم اقوام اور بالخصوص ترک سلطنت کے ٹکڑے ہوتے دیکھے، جس پر اقبال بے حد دلبرداشتہ ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی معاشی ابتری، بدحالی اور کم علمی پر اقبال سخت دلگیر ہوئے۔ 'ملتِ بیضا پر ایک نظر' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں مسلمانوں کو اپنی معاشی حالت سدھارنے اور علمی استعداد بڑھانے کی ترغیب دی۔

اقبال نے معیشت پر اپنے جداگانہ افکار کو نظم و نثر کے ذریعے سے اپنی قوم تک پہنچایا اور اسے ایک اہم اور مستقل موضوع کے طور

پر مشرقی اقوام کے سامنے پیش کیا، مسلمانوں کو نشاط ثانیہ کی ترغیب دی اور مغربی ہتھکنڈوں سے خبردار کیا۔

حوالہ جات

۱ - ایضاً: سید حمید اللہ شاہ ہاشمی: (مترجم): ''زبور عجم مشمولہ کلیات اقبال فارسی'' ص ۵۵۳

۲- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''بانگ درا مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۲۲۴

۳- ایضاً، شیخ عطا اللہ: ''اقبال نامہ، مجموعہ مکاتیب اقبال'' اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۱۹۵۱، ج ۲، ص ۳۱۴

۴- اختر النساء (مرتبہ) ''علامہ اقبال اور زمیندار: روزنامہ زمیندار میں علامہ اقبال سے متعلق خبروں اور مقالات کا انتخاب'' اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۲۰۱۰، ص ۳۴-۴۴

۵- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''ضرب کلیم مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۴۸

۶ - ایضاً، شیخ محمد اقبال ''ارمغان حجاز مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۳

۷- ایضاً، ص ۱۵

۸- ایضاً، ص ۱۷

۹- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''ضرب کلیم مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۸۴

۱۰- ایضاً، ص ۱۹۰

۱۱- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''ارمغان حجاز مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۵

۱۲ - مضمون بحوالہ شمس الدین حسن: روزنامہ ''زمیندار'' لاہور، ۲۳ جون، ۱۹۲۳

۱۳- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''بال جبریل مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۰۹

۱۴- ایضاً، سید حمید اللہ شاہ ہاشمی: (مترجم) ''جاوید نامہ'' مشمولہ کلیات اقبال فارسی'' ص ۷۵۱

۱۵- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''ارمغان حجاز مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۳

۱۶- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''ارمغان حجاز مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۶

۱۷- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''ارمغان حجاز مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۷

۱۸- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''زبور عجم مشمولہ کلیات اقبال فارسی'' ص ۵۰۶

۱۹- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''بانگ درا مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۲۸۰

۲۰- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''بال جبریل مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۰۲

۲۱- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''جاوید نامہ مشمولہ کلیات اقبال فارسی'' ص ۷۵۱

۲۲- ایضاً، شیخ محمد اقبال: ''بال جبریل مشمولہ کلیات اقبال'' ص ۱۱۳

۲۳- ایضاً، ص ۱۱۲

☆☆☆☆☆☆

ڈاکٹر خالدہ انور حساس اور کومل جذبات کی شاعرہ

جو مڑ کے دیکھا وہ منظر کہاں گمان میں تھا
تمھارے ہاتھ میں خنجر کہاں گمان میں تھا

وہ آسماں کہ جسے عمر بھر اُٹھا کے چلی
گرے گا میرے ہی اوپر کہاں گمان میں تھا

بڑے ہی شوق سے مانگیں دعائیں بیٹی کی
یہ بیٹوں کا مقدر کہاں گمان میں تھا

.....

آج کل ہر طرف شعر وسخن کا دور دورہ چل رہا ہے۔ شاعروں اور شاعرات کا حساب نہیں منوں اور ٹنوں کے حساب سے شاعری برآمد ہو رہی ہے، جو ایک ہی ڈگر اور ایک ہی اسلوب میں لکھی جا رہی ہے۔ الفاظ کا ہیر پھیر اور چالاکی سے مصرعہ سازی سب کا ایمان ہے۔ جذبات اور احساسات کا عمل دخل بہت کم کم نظر آتا ہے۔ سب پر مہان شاعر بننے کا بُھوت سوار ہے۔ مشاعروں پر مشاعرے پڑھے جا رہے ہیں مگر ہزاروں لاکھوں اشعار میں سے کوئی بھی شعر نہیں نکلتا۔ سوشل میڈیا کی بھرمار نے اس شوق کو مزید جلا بخشی ہوئی ہے ایسا ادبی ماحول ہے، جس میں خیالات اور الفاظ کی جگالی کی جا رہی ہے۔ ان حالات اور ایسے ادبی ماحول میں کسی سنجیدہ اور سینئر شاعرہ کی ایسی تخلیق کا منصۂ شہود پر آنا جس میں دم، ہو کائناتی شعور ہو، معاشرہ ہو، سماج ہو، جس میں انسان نظر آتا ہو۔ انسانیت نظر آتی ہو۔ خالص اور سچے احساسات و جذبات ہوں کسی طرح بھی ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر خالدہ انور کی کتاب

فیصل زمان چشتی

''کہاں گمان میں تھا'' میں درج بالا تمام اوصاف بدرجۂ اُتم موجود ہیں، جو اُن کی شاعرانہ عظمت کی دلیل بن کر ان کے لیے فخر کا باعث ہیں اور ہمارے لیے بھی اطمینان کا باعث ہیں کہ اب بھی ایسے شاعر اور شاعرات موجود ہیں، جن کی شاعری معاشرے کی نباض ہے اور ہر دل کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری اُن کومل اور لطیف جذبوں کی شاعری ہے، جو سچے اور سُچے ہیں:

تمام عمر کیا ایک دائرے کا سفر
کبھی تو پیش ہو ہم کو بھی قاعدے کا سفر

وہ ایک لمحۂ آخر ہی ذمہ دار نہیں
شروع تو پہلے سے ہوتا ہے حادثے کا سفر

تو آسمان کا تارا، میں ہوں زمیں کا چراغ
کٹے گا کیسے بھلا اتنے فاصلے کا سفر

.....

ان کی شاعری زندگی کی شاعری ہے یہ عام روٹین سے ہٹ کر ایسا کلام ہے جس میں ہمیں ندرتِ خیال، مضمون آفرینی، رنگ و جمالیات اور کمالِ فن اپنی پوری خوبصورتی اور آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے بات کہتے ہوئے کسی تصنع یا بناوٹ کا سہارا نہیں لیا بلکہ بڑی خوبصورتی اور شاعرانہ دلپذیری کے ساتھ اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے دل کی باتیں کہیں ہیں۔ ان کا فکر و فن، شعور و ادراک اور آگہی اپنے اوجِ کمال پر نظر آئی ہے۔ ان کے اشعار میں سچائی ہے، اُجلا پن ہے اور ہماری تہذیب کی وہ روایت موجود ہے، جس پر ہمارے معاشرے کی اساس ہے:

یاد تجھ کو کیا جلا کے چراغ
اور ماتم کیا بجھا کے چراغ

روشنی کی سبیل کرتے ہیں
کاغذوں پر بنا بنا کے چراغ

زندگی کی اندھیری گلیوں میں
کون رکھتا رہا دعا کے چراغ

.....

بہت عرصہ کے بعد کسی خاتون شاعرہ کی اتنی خوبصورت اور بہترین شاعری کی کتاب تشنگانِ ادب کو میسر آئی ہے۔ انھوں نے جذبات اور دل کی کیفیات و شعری سانچے میں ڈھال کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور دنیائے شعر و ادب کو اپنی نئی کتاب ''کہاں گمان میں تھا'' عطا کر دی ہے، جو لوگ

سنجیدہ شاعری کے دیوانے ہیں اور موجودہ شعری منظرنامے سے مایوس رہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب پڑھنے کی چیز ہے:

لمحہ لمحہ کوئی شکن سی ہے
زندگی میرے پیرہن سی ہے

ورد کی لاش دل میں دفن کرو
کیسی بے گور و بے کفن سی ہے

آج بھی آنکھ میں ہیں خواب وہی
آنسوؤں کی وہی جلن سی ہے

.....

ان کی شاعری میں ہمیں زندگی چلتی پھری نظر آتی ہے۔ زندگی کے مسائل انسانی رویے داخلی اور خارجی معاملات پوری ایمانداری، فنی مہارت اور شاعرانہ سلیقے سے بیان کیے گئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''کہاں گمان میں تھا'' پڑھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اردو شاعری کا مستقبل انتہائی تابناک ہے۔ کیونکہ اس کتاب میں ایسے ایسے جہان آباد ہیں جن سے ایک صاحبِ دل اور صاحبِ ذوق کا دل نکلنے کا بالکل نہیں کرتا۔

غلبہ غم یہ عزاداری و ہنگامِ فراق
عرصۂ زیست سے مشروط ہے الزام فراق

گنبدِ جاں میں ابھی تک ہے اسی یاد کی گونج
دیدۂ نم میں لرزتی ہے وہی شامِ فراق

زندگی تج کے، حسیں خوابوں کو منہا کر کے
کر دیے زیست کے عنوان سبھی نامِ فراق

.....

شاعری ہر انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے اور قدرت کا ان پر خاص انعام ہے کہ ان کو شعر کہنے کا منفرد قرینہ عطا کیا ہے۔ اگر ہم کتاب پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بے پناہ تخلیقی وفور پایا جاتا ہے، جس کا ثبوت ان کی غزلوں میں اشعار کی تعداد ہے۔ ایک اور خاص بات ان کی اکثر غزلوں میں کئی مطلع جات کا موجود ہونا ہے اور یہ بات ان کے تخلیقی جوہر، آمد اور مضامین پر گرفت کا پتہ دیتی ہے۔ انھوں نے ہر صنف میں لکھا ہے۔ حمد، نعت، سلام، منقبت، نظم اور غزل وغیرہ لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے، جس میں انھوں نے اپنی محنت ریاضت اور فنی مہارت سے ایسے ایسے اشعار نکالے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والا داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا:

نسخہ ہائے عشق میں کیسا سنبھلنے کا ہنر
اس میں تو بس درج ہے جاں سے گزرنے کا ہنر

گرچہ اس کوشش میں ٹوٹی ہے سدا شاخِ وجود
آ سکا ہم کو کسی صورت نہ جھکنے کا ہنر

.....

مشاعروں، شورشرابے اور کسی ڈور میں شامل ہوئے بغیر ڈاکٹر خالدہ انور اپنا کام بغیر کسی لالچ اور صلہ وستائش کے سرانجام دیے جا رہی ہیں۔ میرے خیال میں وہ سمجھتی ہیں کہ ان کا کام محنت کرنا ہے اور نتیجہ انھوں نے وقت پر چھوڑ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اتنا خوبصورت، شاندار اور منفرد طرز و اسلوب کا حامل شعری مجموعہ اردو ادب کو میسر آیا ہے۔
ان کی نعت میں عقیدت، احترام اور مودّت اور ایسی محبت موجزن ہے جو ادب اور احترام کی نئی منازل طے کرتی نظر آتی ہے۔ اور نعت کو پڑھتے ہوئے قاری سرود و کیف اور عشق و مستی کی پُرنور فضاؤں میں محوِ پرواز رہتا ہے:

کاش ہوتی میں اک کھجور کا باغ
جو کہ ہوتا مرے حضور کا باغ

ہو گئے آسماں زمین ، خوشبو
مہکا جب آپ کے ظہور کا باغ

صبح دم آپ کی زیارت سے
اور کھلتا مرے وفور کا باغ

ڈاکٹر خالدہ انور نے اپنے شعری مجموعے ''کہاں گمان میں تھا'' میں ردائف کا استعمال بڑی عمدگی سے کیا ہے اور عام ڈگر سے ہٹ کر ردیف کو برتا ہے۔ فراق، ہنر، مہکی، چراغ، خواہش، کاش، رخصت، زندہ ہے وغیرہ جیسے منفرد کوائف استعمال کیے ہیں، جس سے ان کے مضامین اور الفاظ کی نشست و برخاست میں نیا پن اور ایک انفرادیت نکھر کر سامنے آئی ہے، جو مختلف قسم کی شعر کہنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ آج کے وقت کی اہم ترین ضرورت بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بہت سی غیر مردّف غزلیں بھی موجود ہیں، جو شاعرہ کی قوتِ اظہار اور تخلیقی جواہر کا پتہ دیتی ہیں۔ کیونکہ عام طور پر غزل میں شعر ردیف کے زور پر اُٹھتا اور بنتا ہے اور اگر ردیف موجود نہ ہو تو خالص تخلیقی جوہر ہی شعر کو کمال تک پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ:

یہ کتاب زندگی ہے اور ہے کتنی ادق
ہو نہ پایا یاد اس کا عمر بھر پہلا سبق

درد کا صحرا نہ ہم سے ہو سکا اب تک عبور
عشق ناہنجار نے روشن کیے چودہ طبق

دیکھ کر اطوار ان کے چپ ہوئی ایسی زبان
آنکھ میں حیرت بھری ہے اور کلیجہ بھی ہے شق

ان کی شاعری کے موضوعات بہت وسیع ہیں عشق، محبت، وارداتِ قلبی سماج، معاشرت، دشمنی، دوستی، منافقت اور مشاہدات و تجربات نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ انھوں نے اپنی شاعری میں زندگی کو محسوس کیا اس کے مختلف ذائقے چکھے کبھی کھٹا اور کبھی میٹھا۔ جیسا جب محسوس کیا اس کو قلمبند کر کے ہمارے سامنے رکھ دیا اور یہی اصل اور حقیقی شاعری ہے کہ جب شاعر اپنا دل کھول کر اپنی تخلیق میں رکھ دے:

اک طرف پیشِ نظر ہیں الفتیں
اک طرف ہیں سامنے کچھ نفرتیں

اُگ رہی ہیں تب سے فصلیں یاس کی
بو رہے ہیں جب سے دل میں حسرتیں

.....

انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے لوگوں کے رویوں، نفرتوں، محبتوں اور چاہتوں کو دل سے محسوس کیا ہے اور ان کی میں چھپی منافقتیں اور تہہ در تہہ لپٹی فریب کاریوں کو بہت اچھی طرح پہچانتی ہیں اور لوگوں کو بھی سمجھنے پرکھنے کا مشورہ دیتی نظر آتی ہیں۔

لمحہ لمحہ روز و شب رونا پڑا
داغ ہستی یوں ہمیں دھونا پڑا

زندگی کے آخری لمحے تلک
بے دلی سے سانس کو ڈھونا پڑا

ایک دھوکہ ہے سراسر زندگی
جب بھی سوچا ہے اُسے ، رونا پڑا

.....

اگر ہم عہدِ حاضر میں ادبی منظرنامے، پر نظر دوڑائیں تو جینوئن خواتین شاعرات کی تعداد انتہائی کم ہے جو کہ ایک تشویشناک بات ہے، لیکن ڈاکٹر خالدہ انور کی کتاب ''کہاں گمان میں تھا'' کو پڑھ کر ہمیں حوصلہ ملا ہے اور امید ہو چلی ہے کہ اب بھی خالص اور حقیقی لوگ موجود ہیں جن کی وجہ سے شاعری میں رمق باقی ہے اور مزید یہ بھی امید کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی ادب میں ان کا کنٹری بیوشن اسی طرح جاری و ساری رہے گا۔ اور آخر میں اُن کے چند اشعار:

رنگ کو نور کو مہکار کو باندھے رکھنا
کیسے ممکن ہے بھلا پیار کو باندھے رکھنا

جو نہیں جانتا دستار کی قدر قیمت
اُس کو زیبا نہیں دستار کو باندھے رکھنا

کم نسب مدِمقابل ہو تو چوکس رہنا
جیت کے بعد بھی تلوار کو باندھے رکھنا

☆☆☆☆☆

شہر غزل کا سفیر..... جناب عقیل رحمانی

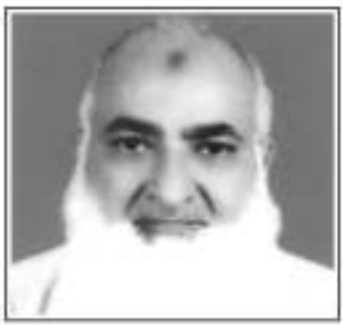

میرے لیے یہ بات باعث طرب ہے۔ کہ میں آج شہر غزل کے ایک خاموش اور صاحب اسلوب قلمکار لیے قلم اٹھا رہا ہوں۔ جی ہاں وہی شہر غزل جس کی مٹی سے جناب بشیر احمد بشیر، جناب جعفر شیرازی، جناب ناصر شہزاد، بسمل صابری، جناب ریاض حسین زیدی، جناب علی رضا، نے نمو پائی۔ وہ شعر وسخن کی محفلوں میں کم کم نظر آتے ہیں۔ مگر خلوت میں رہ کر کلام تازہ کی بے پناہ دولت اکٹھی کر چکے ہیں۔ جی ہاں علم وادب کی دولت جسے نہ کوئی چھین سکتا ہے۔ اور نہ کوئی چرا سکتا ہے۔

جناب عقیل رحمانی تصوف، فکر کے ساتھ شعور وآہنگ کا شاعر ہے۔ آپ کی مضمون آفرینی دراصل سحر آفرینی ہے۔ وہ جدیدیت کے نام پر مادر پدر آزادی کے قائل نہیں ہیں۔ آپ جناب بیدل حیدری کے افکار تازہ نظریات، فلسفہ اور بلند پروازی کو ساتھ لے کر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ بنیادی طور آپ نے غزل ہی کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ تاہم وہ سلام، منقبت، نعت، نظم، قطعہ، رباعی میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور ادب کے کلاسیکل شاعروں کے متعلقات اور منسوبات کے حوالے سے ایک عشق نامہ مرتب کر سکتے ہیں مگر حالات اور واقعات نے انھیں قید کر رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں ان خزانوں کی جھلک بطور خاص دکھائی دیتی ہے۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور سے زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے اور عملی زندگی کا آغاز پرائیویٹ جاب سے کیا۔ جناب عقیل رحمانی ٹیکسٹائل انجینئر ریٹائرڈ ہیں اور ملک کے معروف اداروں میں اپنی تکنیکی

خالق آرزو

مہارتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔
اس وقت میرے سامنے جناب عقیل رحمانی کا دیوان: تتلیاں پھول اور انگارے: پڑا ہے۔ جو کچھ برس پہلے الوقار پبلی کیشنز لاہور سے زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ جس کے ۲۷۱ صفحات ہیں ۔ جس میں شاعری کی تمام اصناف کے تمام رنگ موجود ہیں۔ جناب عقیل رحمانی سے میری ملاقات چند برس قبل ادب سرائے ساہیوال کے ماہانہ محفل مشاعرہ میں ہوئی۔ مجھے یہ جان کر بے حد طمانیت ہوئی آپ ریٹائرڈ ٹیکسٹائل انجینئر ہیں۔ مگر ٹائرڈ بالکل بھی نہیں ہیں۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں، تلخ و شیریں کے مزے چکھ چکے ہیں۔ جتنا عمر کے حساب سے میچور ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ پختہ شاعری کرتے ہیں۔ آپ جناب بیدل حیدری کے شاگرد رشید ہیں۔
بعض لوگوں سے شناسائی تو نئی ہوتی ہے۔ مگر وہ اپنی شخصیت کی دلکشی اور جاذبیت کے سہارے دیرینہ شناساؤں میں چپکے سے جگہ بنا لیتے ہیں۔ کہ آپ کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتے۔ جہاں تک ان کے شعری سفر کا تعلق ہے۔ تو مکمل اور باکمال شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں رکھتے، انسانی جذبات اور احساسات زندگی کے جملہ مسائل کرب و رنج، ہجر وصال، محبتوں اور نفرتوں کا اظہار شاعری سے بہتر اور کہاں ممکن ہے۔ جناب عقیل رحمانی بھی اپنے تمام تر تلخ و شیریں جذبات اور احساسات کو بڑی عمدگی اور مہارت سے شعری حسن میں ڈھال دینے کے فن سے رچے بسے ہوئے ہیں۔ سنجیدہ موضوعات بھی ان کے نوک قلم کو چھو کر ایسے اشعار کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کہ جنہیں پڑھ کر سن کر آپ داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

لمحوں میں انتظار کی صورت اجال دے
سورج نہیں تو اپنے لہو کو اچھال دے

جذبہ اگر ہے تجھ میں سحر لوٹ آئے گی
تاریکیوں میں پھر سے اذان بلال دے

ہر لفظ میں ملے گی اسے پیار کی مہک
وہ میری سوچ کو اگر اپنا جمال دے

بے چین تتلیوں کو سکوں مل ہی جائے گا
کاغذ کے پھول سوکھتی بیلوں پہ ڈال دے

وہ خاموشی کا پیکر بولتا ہے
میرا فن ہے جو پتھر بولتا ہے

ابھی تک اپنے بازو میں سکت ہے
ابھی اپنا مقدر بولتا ہے

زبانیں کاٹ دی ہیں جس نے سب کی
ابھی تک وہ ستم گر بولتا ہے

لمحوں کے طاقچے میں دیا چھوڑ جاؤں گا
میں روشنی ہوں اپنا پتہ چھوڑ جاؤں گا

اے میری پاک ارض وطن تیرے واسطے
اپنے بدن کی خاک شفا چھوڑ جاؤں گا

پھوٹیں گی شاخ دل پہ محبت کی کونپلیں
میں جسم وجاں میں بوئے وفا چھوڑ جاؤں گا

.....

ان کے ہاں عقیدت کی شاعری میں اور غزل میں بھی جابجا روحانی منطق موجود ہے۔ وہ تصوف اور عقیدت کی نزاکتوں کا بخوبی احساس رکھتے ہیں۔ جہاں سوئے ادب کا ادنیٰ سا پہلو بھی پوری عمارت کو زمیں بوس کر دیتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنی عقیدت کا شہادت کا شہادت نامہ مرتب کیا ہے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔ جناب عقیل رحمانی ان تخلیق کاروں میں سے ہیں۔ جن کی شہرت، شرافت اور سادگی سے عبارت ہے:

کل جو کہتا تھا گراں ہے پھول کا سایہ مجھے
سنگ بھی مارو تو کہتا ہے مزہ آیا مجھے

وقت نے روندا، مجھے دنیا نے ٹھکرایا مجھے
کس نے یہ رسوائیوں کا تاج پہنایا مجھے

ایک خوشبو سی رچی ہے وقت کے شوکیس میں
کون سی صورت سجی ہے وقت کے شوکیس میں

رفتہ رفتہ اڑ گئے ہیں ساری یادوں کے ورق
عمر کی آندھی چلی ہے وقت کے شوکیس میں

زندگی کا پیڑ زخموں کا لبادہ کر دیا
غم کی آری نے بدن سارا برادہ کر دیا

پیار کی سب بستیاں پھر راکھ ہونے لگ گئیں
نفرتوں کی آگ کو کس نے زیادہ کر دیا

جب گھٹن بڑھنے لگی اور سانس بھی رکنے لگی
ہم نے دیواریں گرا دیں گھر کشادہ کر دیا

.....

جہیز کی لعنت کے حوالے سے.....

میں کیسے پیلے کروں ہاتھ اپنی بیٹی کے؟
گنوا رہی ہے وہ مفلس شباب قسطوں میں

.....

عقیل رحمانی کتنا بڑا شاعر ہے وہ فیصلہ قاری نے کرنا ہے۔ لیکن جو خود اپنے حوالے سے کہے،، میں گلیاں دا روڑا کوڑا تے محل چڑھایا سائیاں،، یہ بات کوئی بڑا انسان ہی کر سکتا ہے۔ شہر نبی میں خاک چھاننے والا فقیر بے نوا کیسے کیسے جذبات کی بے تابیوں کو مالا بنا دیتا ہے:

اب طواف گنبد خضرا کا منظر دیکھنا
انکے روضے پر ہے سوچوں کا کبوتر دیکھنا

شاخ دل پر کھل اٹھیں گے سینکڑوں چاہت کے پھول
آمنہ کے لعل کا بس نام لے کر دیکھنا

ذہن کے پردے پہ جب وہ چہرہ پرنور ہو
آنکھ کی کھڑکی سے پھر روضے کا منظر دیکھنا

کربلا والوں کے صدقے روزِ محشر بھی حضور
پیاس کے ماروں کو دیں گے جام کوثر دیکھنا

قلب روشن ہو گیا ہر سوچ روشن ہو گئی
ذہن کی تختی پہ جب میں نے لکھا صلِ علیٰ

جز ندامت کچھ نہیں ہے نامہ اعمال میں
ہم سیہ کاروں کو دے دو آسرا صلِ علیٰ

.....

منقبت کا رنگ.....

ٹولیاں اتریں فرشتوں کی قطار اندر قطار
آسماں سے زمیں تک نور کی چادر تنی

ذرہ ذرہ بزم گیتی کا جمال افروز تھا
ہر طرف پھیلی ہوئی تھی نورِ حق کی چاندنی

جاگ اٹھی تقدیر لمحوں نے نگاہیں کھول دیں
تیری آمد پر خدا کے گھر نے بانہیں کھول دیں

.....

جناب عقیل رحمانی کے چہرے پر بہت پر کیف چمک دکھائی دیتی ہے۔ کیوں نا ہو۔ انہوں نے خود کو عشق نبی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اہل بیت سے محبت بھی ان کی شخصیت کا جزو لازم ہے۔ میری اس بات کی تصدیق ان کے کلام سے بخوبی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کریم نے انہیں جادہ دشوار میں عاشقانہ جوش اور عارفانہ ہوش عطا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ سچے عاشق رسول اور پکے غلام اہل بیت اور کھرے مسلمان ہیں۔ فرقہ واریت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گروہ بندیوں سے ماورا ہیں۔ اپنی دنیا میں مست الست درویش ہیں۔ گویا انھوں نے صراطِ مستقیم کے راز کو پالیا ہے۔

ہمارے دامنِ عصیاں بھی اب مہر و رخشاں ہیں
مبارک اپنے حصے میں تیری رحمت کا جام آیا

میرے کشکول میں اب دو جہاں کی بادشاہی ہے
تیرے در کی فقیری سے یہ عالم زیرِ دام آیا

کونے کونے سے ابھر آئی امنگوں کی دھنک
ابر رحمت اسطرح پہلے کبھی برسا نہ تھا

تتلیوں کے پنکھ بن کر ہر خوشی اڑنے لگی
غنچہ غنچہ باغ کا یوں تو کبھی مہکا نہ تھا

.....

محنت کی عظمت کے حوالے سے کہتے ہیں---
محنت سے ہم نے پائی ہے عزت کی سلطنت
اپنے لئے کدال ہی سایہ ہما کا تھا

تشبیہات اور استعاروں کا استعمال کیا خوب کرتے ہیں۔

میں اپنے باپ کا یوسف سا بیٹا
میرا خوں میرے بھائی مانگتے ہیں

.....

اٹلی کے ماہر لسانیات سی او نے کہا کہ اردو میں دنیا کے رابطے کی زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ جبکہ دنیا میں رائج بڑی زبانیں فہم فراست سے ادھوری ہیں۔ جناب عقیل رحمانی اردو اور پنجابی کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ انکا قلم شاعری کی کسی بھی صنف میں رواں ہے۔ وہ اپنی زندگی میں بکھرے بکھرے سے نظر آتے ہیں۔ مگر شعر کو بہت ترتیب سے کہتے ہیں۔ وہ زخموں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جبکہ ان کی نمائش ہرگز نہیں کرتے۔ انہوں نے حمد میں بھی اپنی عقیدتوں اور محبتوں کو خوب برتا ہے:

ہر ایک چہرے کو وہ کوزہ گر نکالتا ہے
بدن کے چاک سے کیا کیا گہر نکالتا ہے

جمیل خود ہے جمیلوں سے پیار ہے اس کو
وہ خوب تر سے بھی کچھ خوب تر نکالتا ہے

بکھیرتا ہے وہ پھولوں کے رنگ صحرا میں
وہ خشک ٹہنی پہ برگ و ثمر نکالتا ہے

اجالتا ہے زمینوں کو آسمانوں کو
فلک کی کوکھ سے شمس و قمر نکالتا ہے

وہ سوکھے پتوں کو دیتا ہے رنگ پھولوں کا
وہ اپنے فضل سے تتلی کے پر نکالتا ہے

.....

اب آخر میں، ،تتلیاں پھول اور انگارے،، میں جناب ریاض حسین زیدی کی رائے جناب عقیل رحمانی کے متعلق..... وہ اپنے دردمند، غم آشنا، خلوص، آگہیں اور محبت خیز لہجے میں زندگی کے جانے پہچانے اور ممکن تاثرات رواں دواں انداز میں قلم بند کرتے ہیں۔ انکا لہجہ دبنگ بھی ہے۔ اور پروقار بھی وہ زندگی کی مثبت اور ایمان افروز اقدار کے داعی ہیں۔ ان میں کہیں بھی زولیدگی، انتشار، افتراق، اور خواہ مخواہ کا بگاڑ جنم نہیں لیتا۔ وہ زندگی کے پائیدار اور تعمیراتی رویوں کو پسند کرتے ہیں۔ انکی شاعری بوقلموں اور رنگا رنگ عنوانات سے مزین ہے۔ اگر غزلیں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ تو نظموں کی رم جھم بھی اپنے جلو میں بہت کچھ لیے ہوئے ہیں۔ جناب عقیل رحمانی کی ترقیوں، تمناؤں، کامرانیوں کے لئے بہت سی دعائیں۔

☆☆☆☆☆

پاکستانی غزل 2010 کے بعد
بکھر گئے ہیں زمانے اِدھر اُدھر میرے

شاعرِ امروز
حارث بلال

شاہد ماکلی

حارث بلال کی غزل اُسی فریم ورک کا حصہ ہے جو جدید ذہن کے مسائل و میلانات کی پیچیدگیوں کی عکس بندی کرتا ہے۔ وہ اپنے داخلی اضطراب سے آسودگی کی کیفیت کشید کرتے ہیں۔ شاعری ان کے لیے مسرت انگیزی کا سرچشمہ ہے۔ وہ کاروانِ عصر میں ایک سطح پہ شامل بھی ہیں اور ایک سطح پہ اس سے کٹ کر کنجِ عافیت کے متمنی و متلاشی بھی ہیں۔ ان کی حد درجہ حساسیت جہاں ان کے حسیاتی توازن میں خلل پزیر رہتی ہے، وہیں ان کی روحانی مکاشفت اُنھیں سنبھالا بھی دیتی ہے۔ یوں وہ ایک نئی توانائی پاتے ہیں اور تازہ دم ہو کر نئی منزلوں کی طرف چل نکلتے ہیں۔

حارث بلال۔ 26 دسمبر 1993 کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ لمز لاہور سے ایم فِل کیمسٹری کی۔ یونیورسٹی آف لاہور سرگودھا کیمپس میں کیمسٹری کے لیکچرر ہیں۔ 2013 سے شاعری کا آغاز کیا اور اپنی ابتدائی غزلوں سے ہی ادبی حلقوں میں شناخت پیدا کر لی تھی۔ ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

فلک کے پار اڑانوں کی حد نہیں ہوتی
وگرنہ دوسری جانب بھی اک زمیں ہوتی

وہ مجھ کو دیکھنے میرے قریب آیا ہے
یہ دھند سارے مہینوں میں کیوں نہیں ہوتی

مجھے زمین سے پانی نہیں ملا حارث
وگرنہ چھاؤں بھی میری یہیں کہیں ہوتی

فلک پہ بھیڑ لگی تھی شکستہ آہوں کی
دعا سے پہلے مجھے راستہ بنانا پڑا

اچھا تری نظر میں بہت مختلف ہوں میں
یعنی تری نظر میں کوئی دوسرا بھی ہے

جیسے طوفان کا امکان سمندر میں رہے
میرے دل میں ترا ہونا کسی ڈر جیسا تھا

حضور! دوسری منزل پہ رہنا بھی دکھ ہے
کہ گھر کا پیڑ بھی مجھ پر ثمر کی حد تک ہے

میں چاہتا ہوں کہ دنیا میں کچھ بڑا کر جاؤں
مرا زمانہ مگر خیر و شر کی حد تک ہے

اس پر ٹھہر سکے تو ٹھہر، چل سکے تو چل
یہ دل قیام گاہ بھی ہے، راستہ بھی ہے

میرے وطن میں یہ بھی سہولت ہے آپ کو
شہروں کے نام سانحوں سے یاد کیجیے!

کسی سے اپنے تعلق کو جانچنا پڑ جائے
تو دیکھنا، وہ تمھیں خواب کیا دکھاتا ہے

گھڑی سے تیز ہے شاید یہ آئنہ حارث
کہ پیچھے والوں کو آگے کھڑا دکھاتا ہے

المختصر تمہاری مہک اوڑھتے ہوئے
احساس ہو گیا کہ اسے پھیلنا بھی ہے

ہم ایک شاخ پہ کھل کر بھی ایک ہو نہ سکے
پھر ایک دن ہُوا گلدان میں ملن اپنا

اتنا بروقت ہُوا ہے ترا ملنا جیسے
پہلی تاریخ پہ مالک کو کرایہ مل جائے

دریا ہوں اور اک عمر سے بہنے میں لگا ہوں
لیکن مرے حصے میں سمندر نہیں آتا

تمہاری یاد کی شدت میں بہنے والا اشک
زمیں میں بو دیا جائے تو آنکھ اگ آئے

سفر سے پہلے کا کچھ وقت ان غموں کے نام
جنھوں نے شاملِ رختِ سفر نہیں ہونا

تیرے توڑے ہوئے اس دل سے تجھے دیکھتے ہیں
اب تو ہم اور بھی مشکل سے تجھے دیکھتے ہیں

میں ڈر گیا تھا حقیقت پسند ہونے سے
اتار پایا نہ دیوار سے تری تصویر

مصوّری سے ادب نے جنم لیا حارث
کہ جب بیان مکمل نہ کر سکی تصویر

یعنی دروازہ بھی اک اسم ہے جس کو پڑھ کر
لوگ دیوار کے اندر سے گزارے جائیں

جیسے کسی تنے سے جُدا ہو تمام پیڑ
میرے ازل، ابد سے بغل گیر ایک پَل!

سب کچھ نئے سرے سے بنانا پڑا مجھے
روکی تھی درمیان میں تعمیر ایک پَل

اب راستہ ملا تو ہَوا کہہ رہی ہے دوست!
تجھ تک پہنچنے کے لیے رفتار چاہیے

دیکھنے، سننے، بنانے کا ریاض اتنا کیا
آخرش اس پھول کی آواز تک تصویر کی

نظر کے فیض کا انکار تو نہیں لیکن
گہر جو ہوتا نہیں ہے، گہر نہیں بنتا

اندھیری شب کا سفر تھا، ہوا تھی، صحرا تھا
دیے کو میں نے بچایا تھا اور دیے نے مجھے

میری نیندوں میں جگہ ڈھونڈنے والے اے دوست
نم کسی آنکھ میں ہوتا نہیں، نم بنتا ہے!

بیچ گملوں میں کبھی پیڑ نہیں بن پاتا
دکھ ترے ہجر میں آتا ہے تو غم بنتا ہے

ہرے ہوئے نہیں اطراف کے شجر میرے
مجھے تو یوں بھی اضافی ہیں بال و پر میرے

بھٹکنے والے بھی اک روز گھر پہنچتے ہیں
بتا رہا تھا کوئی ہاتھ دیکھ کر میرے

کچھ اس لیے بھی مجھے راستہ درست لگا
چلے نہیں تھے مرے ساتھ ہمسفر میرے

تیری خوشبو سے ترے شہر کا نقشہ سمجھا
اس حوالے سے مرا فاصلہ کم بنتا ہے

میں اپنے کھوج میں نکلا تھا رفتگاں کی طرف
بکھر گئے ہیں زمانے اِدھر اُدھر میرے

اُن کی آہستہ روی سے یہ عیاں ہے حارث
اُنھیں خواہش ہے کہ پیچھے سے پکارے جائیں

آواز دی، رگوں میں کھچاؤ سے بل پڑا
اک رگ سے تھوڑی ڈھیل ملی اور میں چل پڑا

میں تجھ کو ڈھونڈتے ہوئے کرنوں میں گھر گیا
میرے وجود سے ترا سایہ نکل پڑا

بجھنے لگا تھا عین سحر کے قریب میں
منزل دکھائی دی تو سفر میں خلل پڑا

آئنہ سامنے حیرت میں پڑا ہوتا ہے
جب ترا عکس مرے ساتھ کھڑا ہوتا ہے

یہ ترا غم ہے جہاں بھر کے غموں میں ایسے
جیسے پودوں میں کوئی پیڑ بڑا ہوتا ہے

کوئی طلوع ہوا اور دھند چھانے لگی
مجھے لگا تھا اندھیرا سحر کی حد تک ہے

مرے پڑوس کے اونچے چوباروں والے لوگ
مجھے بتاتے ہیں دنیا نظر کی حد تک ہے

کام کرتے ہیں تو پھر سامنے آتے ہیں ہم
بڑے لوگوں میں تصاویر نہیں بنواتے

میں اک ادا سے درختوں کے بیچ ٹھہرا رہا
پھر ایک روز کوئی نام لکھ گیا مجھ پر

وہ پچھلے موڑ پر اُس راستے سے ہٹ چکا تھا
میں آنکھیں بند کر کے جس کے پیچھے چل رہا تھا

خدا وہاں کوئی تجھ سا بنا کے بھیجتا ہے
جہاں جہاں سے ہمارا گزر نہیں ہوتا

☆☆☆☆☆

پاکستانی غزل 2010_ کے_ بعد
کسی بھی شے پہ ہمارا کچھ اختیار نہیں

شاعرِ امروز

حسین فرید

شاہد ماکلی

حسین فرید کا تخلیقی کینوس اس لیے بھی وسعت پزیر ہے کہ ایک طرف تو وہ قدیم شعریات کے سنجیدہ مطالعے کا ذوق رکھتے ہیں اور دوسری طرف جدید شعریات کے سرچشموں سے جڑے ہوئے ہیں - وہ کلاسیکی ادبیات کے کئی شعری وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں - خاص طور پر استعارے اور ترکیب کے برتاؤ کا عمل ان کے ہاں فطری اور بے ساختہ ہے- انگریزی ادب سے وابستگی بھی ان کے تنقیدی اور تخلیقی شعور کی بالیدگی میں کردار ادا کر رہی ہے- اگر وہ استعارے کی کارفرمائی پر بیش از بیش توجہ دیں اور اس کے جادوئی اور مخفی امکانات کو زیادہ سے زیادہ کھنگالنے کی سعی کریں تو ان کی غزل نہ صرف نئی معنوی جہات سے ثروت مند ہوگی بلکہ اس سے ان کے ہاں وہ رمزیت اور ایمائیت بھی مزید پیدا ہو گی جو غزل کا بنیادی اور امتیازی وصف سمجھی جاتی ہے-

حسین فرید 18 اگست 1998 کو تلمبہ کے نواحی گاؤں رام پور مگھہ میں پیدا ہوئے- 2019 سے شعر گوئی آغاز کی- یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب لاہور سے انگلش لٹریچر میں ایم فل کر رہے ہیں- ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

لباسِ زیست پہ چھلکا اگر ایاغِ اجل
تو ایک عمر چمکتا رہے گا داغِ اجل

خبر نہیں، ہمیں کس کی لپک تمام کرے
ادھر چراغِ نظر ہے ، اُدھر چراغِ اجل

اسے غرض ہی نہیں موسموں سے کوئی حسین
بس ایک سوگ کا پھل دے رہا ہے باغِ اجل

جو مری خاک سے ہیں بالیدہ
وہ بھی کہتے ہیں ، ریگ زار ہوں میں

اک تو آنے لگے ہیں گریے کے دن
اور پہلے سے اشک بار ہوں میں

پھر مجھے زین سے اتارا گیا
میں سمجھتا تھا شہ سوار ہوں میں

زمین دائرہ در دائرہ طواف میں ہے
کسی بھی شے پہ ہمارا کچھ اختیار نہیں

کیا زندگی ہے جس میں کوئی کام تک نہ ہو
کرنے کو مل بھی جائے تو انجام تک نہ ہو

تمہارے واسطے موجود ہے کوئی لمحہ
ذرا سا صبر کرو ، تھوڑا انتظار کرو

ہماری چپ کے توسط سے ہو گیا اعجاز
جو کم سخن تھا ، اسی نے سخن زیادہ کیا

یہ بات شعری روایت ہمیں بتائے گی
سخن کیا ہے کہ حضرت نے استفادہ کیا

بہت سے راستے ہموار تھے ہمارے لیے
میں انتخاب نہیں کر سکا تمھارے لیے

کوئی لے گیا مری آشنائیاں رات سے
مرے واسطے کوئی روشنی کی کرن ہوا

انتظارِ صبح میں ضائع کرو گے رات کو؟
برسرِ آبِ رواں مہتاب نے آواز دی

آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا
ایسا منظر جو تُو دکھاتا ہے

راہ ہوتی ہے دل کو دل سے مگر
کوئی تو راستہ بناتا ہے

آپ کے آنکھ موند لینے سے
ہر طرف ہی اندھیرا چھاتا ہے

جو پہلے کہہ رہا تھا ، راستہ بدلنا نہیں
وہ پہلے موڑ پہ ہی راستہ بدلنے لگا

ہر گام ظلم و جور ہے ، ہر آن کربلا
یہ مرثیے کا دور ہے، اور میں ! غزل سرا

میرے نغموں پہ مضطرب کیوں ہو
میرے نوحوں پہ تالیاں کیسی

آپ تہذیب کے مبلّغ تھے
آپ کے لب پہ گالیاں کیسی

کچھ اس لیے بھی توازن نہ رہ سکا قائم
جو ہاتھ تیغ پہ ہونا تھا وہ لگام پہ ہے

دشت کو خون سے سیراب کیا پیاسوں نے
تب سے یہ رسم چلی دشت میں گُل کاری کی

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا ''افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

دوسرا اتفاق یہ تھا کہ میاں بشیر وہاں موجود تھا۔ میں نے اپنے مضمون 'قصہ ایک قالین کا' میں ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میاں صاحب زیورچ کے اسلحہ کے سوداگر ممتاز میکری کے مہمان تھے۔ میکری نے انھیں دریائے لمات کے کنارے بنے ہوئے فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ چاہتے تو سیون سٹار کا مزہ بھی لوٹ سکتے تھے۔ میاں صاحب کا داماد کرنل عطا لندن کی ایمبیسی میں فوج کی طرف سے تعینات اسلحہ انسپکٹر تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی مہر کے بغیر کوئی ڈیل ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لئے اسلحہ ڈیلر اُس کے آگے پیچھے پھرتے۔ میاں صاحب

ساری زندگی ملک سے باہر نہیں گئے تھے۔ اب جو آ ہی گئے تھے تو پھر سیر سپاٹا تو کرنا ہی تھا۔

طے یہ پایا کہ میں دو دن میاں صاحب کے ساتھ رہوں گا۔ اس کے بعد میاں صاحب کو اٹلی جا کر کسی اور آرمز ڈیلر کو شرف میزبانی بخشنا تھا اور مجھے نجیب اللہ نیازی کے گھریلو ماحول میں رہنا تھا۔ ہوٹل کی چودھویں منزل سے نیچے جھانکا تو طبیعت خوش ہوگئی۔ دریائے لمات ہوٹل کو عملاً چھوتا ہوا مستانہ وار گزر رہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں جوان لڑکے اور لڑکیاں دریا میں سوئمنگ کر رہے تھے۔ پانی خاصا ٹھنڈا تھا لیکن وہ کوئی تہوار تھا جس میں اشنان کرنا ایک قسم کا قومی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ میاں صاحب نے چائے منگوائی اور اس کے ساتھ فنگر فش، سینڈوچز اور چکن آلا کیو کا آرڈر دیا۔

عرض کیا ”لنچ کچھ ہیوی نہیں ہوگیا؟“

ہنس کر بولے ”لنچ تو نیچے ریسٹورنٹ میں جا کر کرنا ہے۔ یہ تو شروعات ہے۔ چاہو تو اپی ٹائزر بھی کہہ سکتے ہو۔ بھائی! میاں صاحب کے مہمان ہو، کسی ایرے غیرے کے پاس نہیں ٹھہرے۔“ ایمانداری کی بات ہے کہ اس روز ہمیں میاں اور میکری میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا۔

لنچ کے بعد میاں صاحب شہر دکھانے لے گئے۔ کہنے لگے ”پیدل چلیں گے اگر صحیح طرح کسی شہر کے خدوخال دیکھنے ہوں تو کبھی گاڑی میں نہ بیٹھو۔ کار میں بیٹھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی سٹی نہیں بلکہ پردہ سکرین پر کوئی فلم دیکھ رہا ہے۔“ میں نے لندن شہر کے محلوں، گلی کوچوں کو ان قدموں سے ناپا ہے۔ شہر کی پلاننگ سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ گوری چمڑی والے کیسے اور کیونکر دنیا پر چھا گئے۔

زیورچ نسبتاً چھوٹا لیکن صاف ستھرا شہر ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا سب سے بڑا اور مہنگا شہر بھی یہی ہے۔ ہم ڈاؤن ٹاؤن میں بہانوف اسٹراسے گئے۔ میاں صاحب نے بتایا کہ فرانس کے شانزے لیزا، لندن کی آکسفورڈ سٹریٹ کی طرح یہ بھی مشہور ترین علاقہ ہے۔ جہاں شاپنگ کے لئے ہالی وڈ کے اداکار، یورپ کے شہزادے اور امریکہ کے ٹائیکون آتے ہیں۔ اسی شہر میں شاہ ایران کی ملکہ فرح دیبا نے ایک لاکھ ڈالر کا فرکوٹ خریدا تھا۔ الزبتھ ٹیلر نے اپنی پانچویں شادی پر رچرڈ برٹن کو ہیروں سے جڑی رولکس گھڑی تحفے میں دی تھی۔ جینا لولو بریجڈا نے ہائی ہیلز سینڈل لئے تھے۔ جنہیں پہن کر اس نے Hunch back of Notra Dam میں کام کیا تھا۔ سوئٹزر لینڈ کے سینڈل اور اٹلی کا حسن، فلم نے ہٹ تو ہونا ہی تھا۔ اور مارلن منرو نے وہ تاریخی

بلاؤز بھی اسی بازار سے لیا تھا جسے غلطی سے وہ صدر کینیڈی کے بیڈروم میں چھوڑ آئی تھی اور جس کو غصیلی جیکی نے صدر کے منہ پر مارتے ہوئے کہا تھا Take is. It is not my size کمال ہے! میں نے تعریفی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔

''یورپ بڑا بدقسمت ہے جو آپ نے یہاں آنے میں اتنی دیر کر دی نہیں تو آج انھیں کسی اور مورخ کی ضرورت پیش نہ آتی۔

یہ متعصب لوگ ہیں۔ کبھی اپنی کمزوریوں کو اُجاگر نہیں کرتے۔ وہ تو ہم ہیں کہ جو کام نہ بھی کیا ہوا سے بھی سرداروں کی طرح اپنے کھاتے میں ڈال لیتے ہیں۔ وہ مسکرائے۔

اتنی مہنگی جگہ پر ہم نے بھی شاپنگ کر ڈالی تاکہ قسم تو کھائی جا سکے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو بہانوف اسٹراسے میں شاپنگ کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شاپنگ اس سٹور سے کی جو دیوالیہ ہو گیا تھا اور وہ اس کی بندش کا آخری دن تھا۔ بچا کھچا مال کوڑیوں کے بھاؤ بک رہا تھا۔ اس بہتی گنگا میں ہم نے بھی ہاتھ دھو ڈالے۔ ایک جوتوں کا جوڑا اور انالین کاٹن کا کالا کوٹ خریدا۔

رات کو ممتاز میکری نے میرے اعزاز میں ڈنر کیا تھا۔ اگر میں ''تشریف'' نہ بھی لاتا تو غالباً ڈنر پھر بھی ہونا تھا۔ اگر فرق تھا صرف اتنا کہ میاں صاحب نے کمال ہشیاری سے اسے میرے نام کر دیا تھا۔ کھانے سے پہلے ہم نے شہر کا بقیہ حصہ بھی دیکھ ڈالا۔ سوئٹزر لینڈ گھڑیوں کے لیے مشہور ہے۔ ایک دکان پر گئے تو حیران رہ گئے۔ اس قدر مہنگی گھڑیاں ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ شیخ زید جاتے ہوئے گھڑیوں کا تحفہ دے جاتا تھا لیکن اس کا ہمہ مستعد عملہ بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر بانٹتا تھا۔ یہاں پر ایسی گھڑیاں بھی تھیں جو سر سے لے کر پاؤں تک ہیروں سے لدی ہوئی تھیں۔ ڈائل کے علاوہ چین تک ہیروں سے مزین تھے اور جن کی قیمت لاکھ روپے نہیں لاکھ ڈالر تھی۔

دریا کا بائیں کنارہ مکمل آباد تھا۔ بے شمار دکانیں اور جگمگ کرتی روشنیاں دامن نگاہ تھامتی تھیں لیکن دائیں کنارے پر روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ درختوں کے جھنڈ تھے اور ایک عجیب طرح کی خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔ میرے استفسار پر میاں صاحب بتایا کہ وہاں پر منشیات کا اڈہ ہے۔ نشئی لوگ سرِ شام ہی آ جاتے ہیں اور ہیروئن کی چند چٹکیوں کے لئے دن بھر کی کمائی موت کے سوداگروں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ پولیس بھی چشم پوشی کرتی ہے۔ پکڑنے کی صورت میں بار کفالت حکومت پر آ جاتا ہے۔ اگر دورانِ حراست کوئی شخص 'سفوف' نہ ملنے سے چل بسے تو اس کے رشتہ دار لاکھوں ڈالر کے ہرجانے کا دعویٰ کر دیتے ہیں۔ وکیل فنڈی

ففتی کے معاہدے کے تحت ان کا مفت مقدمہ لڑتے ہیں۔ یہ اس روشن ترین ملک کا تاریک پہلو ہے۔ یہ لوگ تو آہستہ آہستہ سسک سسک کر، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ اصل چاندی تو ان ڈاتوں کی ہے جن تک پولیس کبھی بھی نہیں پہنچ پاتی۔ انھوں نے اپنے اردگرد قانونی حصار کھڑے کر رکھتے ہوتے ہیں۔ ملک کے قابل ترین وکیلوں کی فوج ظفر موج ان کے دفاع کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتی ہے۔

ہم نے دریا کے دوسرے کنارے پر جا کر ان کی حالتِ زار دیکھی۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، اڑے اڑے سے بال، دنیا مافیہا سے بے خبر، اپنے آپ میں گم۔ یہ لوگ بھی اس ملک کے شہری ہیں جس کے حسن، رعنائی اور رنگینی کے چرچے چار دانگ عالم میں ہیں۔

ڈنر کا مزہ کرکرا ہو گیا حالانکہ میکری نے پورا ٹیبل ریزرو کرایا تھا۔ کیپرے ڈانسرز فرانس سے آئی تھیں۔ ویک اینڈ تھا۔ ڈائننگ ہال فل تھا۔ کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میکری ہندوستانی مسلمان تھا جو ایک طویل عرصہ سے سوئٹزرلینڈ میں آباد تھا۔ چونکہ کاروبار چمک اُٹھا تھا اس لیے واپس جانے کا خیال ہی ترک کر دیا تھا۔ ویسے بھی وہاں کیا رکھا تھا۔ کہنے کو تو انڈیا سیکولر سٹیٹ ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ وہاں ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ آئینی تحفظات معروضی حقائق کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ وہ بچے کھچے لوگ جو تقسیم کے خلاف تھے اب سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

اگلے دن میاں صاحب نے اپنے ایک عزیز کے ساتھ مجھے جنیوا بھیج دیا۔ عدنان اپنی کار لے آیا اور ہم ناشتہ کر کے روانہ ہو گئے۔ جب شہر سے باہر نکلے تو ملک کے حسن کا صحیح اندازہ ہوا۔ مشہور تھا کہ فرانس میں شیشے کی سڑکیں ہیں۔ اس ملک میں شیشے کی دیواریں دیکھیں۔ اکثر فیکٹریوں کی باؤنڈری وال شیشے کی تھی۔ سرسبز پہاڑ، گلہائے رنگا رنگ اور شفاف جھیلوں نے شیر و شکر ہو کر اس ملک کو حسن و رعنائی بخشی ہے۔ جھیلوں کا لامتناہی سلسلہ ہے، حد نگاہ تک پھولوں کی قطاریں ہیں۔ سنتریوں کی سبز وردی پہنے پہاڑ ایستادہ ہیں۔ کہیں کہیں چوٹیوں پر برف کی سفید چادر جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سردیوں میں منظر یکسر بدل جاتا ہے۔ سارا ملک برف سے ڈھک جاتا ہے۔ گو ملک چھوٹا ہے لیکن دیدنی ہے۔ اسے Play ground of Europe بھی کہا جاتا ہے۔ پہاڑ زیادہ اونچے نہیں ہیں لیکن برف پوش ہیں۔ فلاحی ریاست ہے اگر کسی شخص نے پہاڑ کی چوٹی پر مکان بنا لیا ہے تو بھی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اسے وہاں

پانی، بجلی، گیس اور سڑک فراہم کرے۔ چار قومی زبانیں ہیں۔ Referendum & Recall آئین کا اہم جزو ہیں۔ جنگ عظیم میں یہ واحد ملک تھا جو بارود کی بو سے بچا رہا۔ اس نے غیر جانب داری اختیار کی۔ جرمن چاہتے تو ایک دن میں روند ڈالتے۔ وہ بھی اس کے حسن کو پامال نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم میں یورپ تباہ ہو گیا لیکن یہ مالا مال ہو گیا۔ اس کے بینک Secrecy کی وجہ سے مشہور ہیں۔ غیر ملکی حکمرانوں اور امیر آدمیوں نے اربوں ڈالر جمع کرا رکھے تھے۔ وہ مرکھپ گئے یا روپوش ہو گئے رقم بینکوں میں ہی رہی۔

زیورچ سے جنیوا سو میل کے فاصلے پر ہے۔ مناظر اس قدر دلکش ہیں کہ سفر کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ریل کی پٹڑی ہے۔ اکثر سیاح ریل سے سفر کرتے ہیں۔ ریلوے لائن، لہراتی، بل کھاتی جب پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی ہے تو بہت بھلی لگتی ہے۔ سرنگوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ پہاڑ کاٹنے کے بجائے اس میں سوراخ کر دیا جاتا ہے۔ زیورچ اور جنیوا کے درمیان وی وی جھیل ہے جو تیس کلومیٹر کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ریسٹورنٹ ہے۔ ٹورسٹ یہاں تھوڑی دیر رکتے ہیں اور چائے پانی پی کر تازہ دم ہوتے ہیں اور بلندی سے فوٹو گرافی کرتے ہیں۔ ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے رکے۔ عدنان اندر کافی لینے چلا گیا تو میں نے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ایک سوئس بھی کھڑا تھا۔ اس سے رسمی علیک سلیک ہوئی۔ میں نے کہا "تمہارا ملک بہت خوبصورت ہے۔"

بولا "نہیں تمہارا اس سے کہیں بہتر ہے۔ صرف تم لوگوں کو احساس نہیں۔ اس نعمت خداوندی کی قدر نہیں کرتے۔ ہمارے ملک کا سب سے اونچا پہاڑ آٹھ ہزار فٹ بلند ہے۔ تمہارے پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ ۲۸ ہزار فٹ بلند، سوچ کر ہی جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ Rugged beauty, virgin snows, untouched by human hands. میں اسے کیا جواب دیتا۔ یہی کہ تمہارے ملک میں تو جھیلوں کا جال ہے، پانی کی فراوانی ہے۔ ہم ساٹھ سال کے عرصے میں ڈیم بھی نہیں بنا سکے۔ کالا باغ، بھاشا اور سکردو بن جاتے تو کیا ہوتا۔ پانی کی فراوانی، بجلی کی ارزانی، ایک وقت تھا کہ تیل کو کالا سونا کہتے تھے۔ ایک وقت آئے گا کہ پانی گدلا سونا کہلائے گا۔ یہ ملک کبھی صحرا بن گیا تو مورخ کس کو مورد الزام ٹھہرائیں گے۔؟ تو میں بنتی بگڑتی رہتی

ہیں - تہذیبیں اُبھرتی ڈوبتی رہتی ہیں - اقوام عالم کی تاریخ میں یہ کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم نے اجتماعی خودکشی کر لی ہو۔

ہم جب جنیوا پہنچے تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ ہم کافی دیر تک شہر میں بے مقصد گھومتے رہے۔ جہاں تک شہر کا تعلق ہے یہ بھی عام شہروں جیسا ہے۔ جو چیز اسے منفرد اور ممتاز کرتی ہے وہ اس کی جھیل اور اقوام متحدہ کی مختلف ایجنسیوں کے ہیڈ کوارٹرز ہیں - جھیل کے دوسری جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن پر امیر آدمیوں کے ولاز ہیں۔ ہم نے کشتی میں بیٹھ کر جھیل کا ایک چکر لگایا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ اگست کے مہینے میں سارے یورپ میں بہار ہوتی ہے۔ لوگ ساحلوں پر جا کر غسل آفتابی کرتے ہیں۔ ہم ایجنسیوں کے ہیڈ کوارٹر میں نہ جا سکے، وقت کی کمی تھی۔ ان کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لئے بھی خاصا وقت چاہئے تھا۔ میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں، اس علاقے کی تاریخ، جغرافیہ، کلچر، اور دیگر امور کے متعلق قبل از روانگی مطالعہ کرتا ہوں۔ ایک سفرنامہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے جنیوا میرے شیڈول میں نہ تھا۔ یہ عدنان کی مہربانی تھی جس نے پیشگی نوٹس کے بغیر سیر کرا دی۔ عدنان لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ زیورچ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ساتھ ہی نوکری بھی۔ اکثر طالب علموں کو یہ دونوں کام کرنا پڑتے ہیں۔ آدمی اگر ٹھیک طرح سے دو تین دن کام کرے تو ہفتے کا خرچ نکل آتا ہے۔

جب ہم زیورچ واپس پہنچے تو رات ہوا چلی تھی۔ میاں صاحب کے ساتھ ڈنر کیا اور تھکن کی وجہ سے جلد سو گیا۔ دوسرے دن وہ اٹلی چلے گئے اور میں نجیب اللہ نیازی کی رہائش گاہ پر منتقل ہو گیا۔ نجیب اللہ کا گھر بھی دریا کے قریب تھا اس لئے مجھے صبح کی سیر کرنے میں سہولت رہی۔ صبح کا وقت ہو، آئینے کی طرح بہتے ہوئے شفاف دریا کا عکس ہو اور ہلکورے لیتی ہوئی بادِ نسیم تو سیر کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ نجیب کی بیگم بڑی ملنسار تھیں - مغربی ماحول میں پروردہ نوجوان نے شادی بھی کی تو لاہور میں۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا جو اس نے سوچ سمجھ کر کیا۔ ان کے دو بچے تھے۔ وہ بھی نجیب کی طرح باپ کی صباحت اور ماں کی ملاحت لے کر پیدا ہوئے۔ میں اس کے ہاں تین دن رہا۔ اس عرصے میں سارے سوئٹزرلینڈ کی سیر کر لی۔ دریائے رائین Rhine دیکھنے گئے۔ مسرت اور تاسف کے جذبوں نے بیک وقت ذہن کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ چونکہ پہاڑی علاقہ تھا اس لئے شوریدہ سر دریا پوری سرعت رفتار کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ یہ دریا سمندر میں گرنے سے پہلے پانچ ممالک جرمنی، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، فرانس

وغیرہ سے گزرتا ہے۔ پانچوں ممالک نے افہام و تفہیم سے پانی بانٹ لیا ہے۔ ان کے درمیان کسی قسم کا جھگڑا یا تلخی نہیں ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پچاس سال سے کالا باغ ڈیم کا مسئلہ حل نہیں کر سکے۔ پانی عطیہ خداوندی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ اس کو ضائع کرنا اگر کفرانِ نعمت نہیں تو پھر کیا ہے؟ دریا کے کناروں پر پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جو دریا کے اندر تک جاتی ہیں۔ نجیب کے مشورے پر میں نے جوتے اُتار کے پاؤں ٹھنڈے پانی میں ڈال دیئے۔ وہ بڑے کیف آور لمحات تھے۔ جب میں نے پاؤں باہر نکالے تو ایسے محسوس ہوا جیسے دریا کا پانی اپنے ساتھ ساری تھکن بھی لے گیا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے دریا اور جھیلیں آلودگی سے پاک ہیں۔ قانوناً ان میں گندی چیز پھینکنا منع ہے۔ ویسے بھی مہذب شہری قانون کا احترام کرتے ہیں۔ دریا کے قریب ہی ایک پرانا قلعہ تھا جس کے کھنڈر بتا رہے تھے کہ کسی زمانے میں عمارت عظیم رہی ہوگی۔ اگلے وقتوں میں ان کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ شکست خوردہ شاہوں کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوتے۔ غنیم کے لئے غیر معینہ عرصے کے لیے محاصرہ مشکل ہو جاتا۔ آج کل ہوائی جہازوں اور میزائلوں کا دور ہے۔ بھگوڑوں کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

میں نے ریل گاڑی کو کبھی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر عموداً کسی کوہ پیما کی طرح چڑھتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ نجیب زیورچ سے پچاس میل دور Inter laken لے گیا۔ اس نے کار پارکنگ میں کھڑی کی اور ریل کے دو ٹکٹ خریدے۔ ٹکٹ خریدنے میں نصف گھنٹہ لگ گیا کیونکہ وہاں بھی ٹورسٹ کی لمبی لائن لگی تھی۔ جب ٹرین چلی تو خوف آنے لگا۔ اگر یہ پھسل کر نیچے لڑھک گئی تو کیا ہوگا۔ نجیب نے مجھے تسلی دی کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ دراصل گاڑی دو پہیوں کی جگہ تین پر چلتی تھی۔ تیسرا Tooth wheel تھا جو توازن قائم رکھتا تھا اور اسے سلپ نہیں ہونے دیتا۔

آخری ٹرمینل پر گاڑی رُکی تو سیاحوں نے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ نجیب نے کہا چلو وہاں تک پیدل چلتے ہیں۔ اُوپر ریسٹورنٹ ہے۔ بڑے عمدہ برگر اور کافی ملتی ہے۔ ہم Hitch hiking کرتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو میری سانس پھول گئی اور پسینہ آنے لگا۔ اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ بولا ''خیریت تو ہے تمہارا رنگ پیلا پڑنے لگا ہے؟''

''بہت عمودی چڑھائی ہے۔ شاید میں اس کا عادی نہیں ہوں''۔

کہنے لگا ''لیکن میں بھی تو چڑھا ہوں۔ میری سانسیں ہموار ہیں۔''

''تم یہاں کے جم پل ہو۔ نسبتاً جوان ہو پھر تم لوگوں کا تو یہ روزمرہ کا معمول ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر بعد میری طبیعت سنبھل گئی تو ہم نے چکن برگر کھایا اور کافی پی۔

ہم کچھ دیر ٹھہرے اور خوب گھوم پھر کر ارد گرد کے مناظر کو دیکھا۔ نیچے جھیلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بے شمار ندی نالے دریاؤں میں گر رہے تھے۔ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے ایک دوسرے کے ساتھ آنکھ مچولی کر رہے تھے۔ پرندے، اٹکھیلیاں کرتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ان حسین نظاروں میں کھو گیا۔

''کہاں کھو گئے ہیں؟'' نجیب نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''سوچ رہا ہوں کہ تم لوگ بڑے خوش قسمت ہو۔ اس ملک میں رہتے ہو جس کی فضائیں نغمہ ریز ہیں، ہوائیں عطر بیز ہیں۔ دریا صرف بہتے ہی نہیں باتیں بھی کرتے ہیں۔ فطرت دعوت نظارہ ہی نہیں دیتی بلکہ کھلے اشارے بھی کرتی ہے۔ ہفتے میں پانچ دن کام دو دن مکمل چھٹی۔ سال کی تعطیلات الگ۔ لوگ اپنے سارے تفکرات دفتر میں چھوڑ آتے ہیں۔ ریاست ماں ہی نہیں باپ بھی ہے۔ تو چراباشی بفکر جتلا کی صدائیں دیتی ہوئی، تمام تفکرات کی کارساز اور ایک ہم ہیں کہ کولہو کے بیل کی طرح چوبیس گھنٹے جتے رہتے ہیں۔ کوئی غریب ہے تو اسے روٹی کی فکر ہے۔ امیر ہے تو لٹنے کا ڈر۔ ہماری طرح سرکاری ملازم ہے تو آدھا وقت نوکری کرتا ہے اور آدھا اس کی حفاظت میں گزار دیتا ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ دھڑن تختہ نہ ہو جائے۔ گندم اکٹھی کرنے کا ٹارگٹ پورا نہ ہوا، دریا کناروں سے باہر نکل آئے۔ کوئی وبائی مرض پھوٹ پڑا۔ محرم اور عیدین میں تصادم ہو گیا تو ڈپٹی کمشنر کی شامت آ جاتی ہے۔ ہر غضب آلود نگاہ اس پر جمتی ہے۔ ہر تہمت کی انگلی اس کی سمت اٹھتی ہے۔ اگر واش روم جانا ہو تو بھی چار آدمی فون پر بٹھا کر جاتا ہے مبادا پیچھے چیف منسٹر یا چیف سیکرٹری کا فون آ جائے۔ کوئی وقت اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں جو فراغت کا ہو۔ کمشنر ڈی جی خان احمد سلیم شاہ راتوں رات یک بینی دو گوش نکال دیا گیا کیونکہ رات ایک بجے فون کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ دتو نے اس کی زبان کی لکنت پکڑ لی تھی۔ اس نے بڑی وضاحت کی کہ بات کرتے ہوئے صحیح حالت میں تھا۔ چیف منسٹر اسے ڈانٹتے ہوئے بولا ''پڑھے ہوؤں کو پڑھاتے ہو۔ کیا میں خوابیدہ شخص اور ٹن ہونے والے کی ٹون میں تمیز نہیں برت سکتا۔''

''جانتے ہو یہ چھٹی لینے کے لئے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ ایک درویش منش کمشنر

مجھے فقیر بنانے پر تل ہی گیا تھا۔"

کہنے لگا "مسٹر شاہ! اپنی یہ مدقوق منطق اپنے پاس رکھو۔ لگتا ہے کہ چڑھائی چڑھنے سے تمہارا دماغ سرک گیا ہے یا تخیل کسی مخصوص سمت میں مائل پرواز ہے۔ زور بیان حقائق کو مسخ نہیں کر سکتا۔ میں یورپ کا باسی ہی نہیں رحیم یار خان کا زمیندار بھی ہوں۔ تم نے ہماری طرز زندگی کے متعلق جو قصیدہ پڑھا ہے اس کی حقیقت جاننا چاہتے ہو؟" وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا "حقیقت یہ ہے کہ ہم انسان نہیں روبوٹ ہیں۔ اپنے کپڑے ہم خود دھوتے ہیں۔ استری خود پھیرتے ہیں۔ گھر کی صفائی کرنا پڑتی ہے۔ کھانا خود پکانا پڑتا ہے۔ جوتے بھی ہم میاں بیوی باری باری پالش کرتے ہیں۔ صبح اُٹھ کر بچوں کو تیار کرنا، انھیں سکول چھوڑنا اور شام کو وقت پر واپس لانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمارے پاس کوئی ڈرائیور نہیں ہے۔ نوکر رکھنے کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ ایک دن ہوٹل میں جا کر ڈنر کر لیں تو سارا مہینہ بجٹ بیلنس نہیں ہوتا۔ وقت پر دفتر جانا پڑتا ہے، ایک منٹ کی تاخیر نہیں ہو سکتی۔ دفتری اوقات میں سگریٹ کے مرغولے نہیں چھوڑے جا سکتے، چائے کی چسکیاں نہیں لی جا سکتیں۔

اس کے برعکس تم لوگوں کی چاندی ہے۔ سورج نصف النہار پر ہوتا ہے تو تم لوگ دفتر پہنچتے ہو، دو بجے جمائیاں آنے لگتی ہیں۔ سائل باہر انتظار کرتے کرتے بت بن جاتے ہیں۔ اندر صاحب بہادر دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ جب بھی پوچھو ایک ہی جواب ملتا ہے صاحب میٹنگ میں ہیں۔ یہ کس قسم کی میٹنگ ہے جو سارا سال چلتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ملک میں بے شمار غریب بھی ہیں لیکن میں تم صاحب بہادروں کی بات کر رہا ہوں۔ نوکروں کی فوج ظفر موج، سو کنال میں پھیلے وسیع و عریض بنگلے، گاڑیوں کا پورا آرمیڈا، باورچی، ڈرائیور، دھوبی، مصاحبی، مالشیے، خوشامدی، مصاحب۔ اتنے ٹھاٹ بھاٹ تو ہمارے وزیراعظم کے نہیں ہیں۔ یہاں وزیر اپنی گاڑی خود چلاتے ہیں۔ بعض تو بائیسکلوں پر دفتر آتے ہیں۔ بھائی صاحب! کیا فضول بحث چھیڑ بیٹھے ہو۔"

میں اسے کیا جواب دیتا۔ اس نے میرے نہلے پر نہ صرف دہلا مارا تھا بلکہ ساری بساط ہی اُلٹ کر رکھ دی تھی۔ صرف اتنا کہا "نیازی پٹھان چاہے دنیا کے کسی گوشے میں کیوں نہ چلا جائے رہتا تو نیازی ہے۔"

[جاری ہے۔]

غزل

روز کے روز اک کُنج بسائیں
کاش یہ دُکھ تنکے بن جائیں

دانہ دُنکا چُگنے نکلیں،
چوگا لے کر گھر کو آئیں

تڑکے تڑکے سانجھ کی فکریں
بَھور کے ساتھ بَھنور پڑ جائیں

جال میں دَانہ رَکھنے والو
ہم یہ بھورے کب تک کھائیں

کاش آنکھوں کو آ لیں جالے
ہونٹوں پر تالے پڑ جائیں

بُھولے بسرے جھونکے خالد
کِن یادوں کی دُھول اڑائیں

خالد احمد

غزل

آصف ثاقب

آپ کاغذ پہ گال رکھتے ہیں
ہم کلیجہ نکال رکھتے ہیں

پیار دیکھو ہزارے والوں کا
ماں کی یادیں سنبھال رکھتے ہیں

بھولتے ہیں بھلا نہیں پاتے
ہم یہی تو کمال رکھتے ہیں

اُن کا چہرہ ہے نیلا پیلا سا
اور آنکھیں بھی لال رکھتے ہیں

ہم سے آگے بڑھا نہیں جاتا
آپ ہرنی کی چال رکھتے ہیں

آنکھ ہم نے بنائی کشمیری
جھیل ڈل کی مثال رکھتے ہیں

پرورش غم کی ہم نہیں کرتے
وسوسے دل میں پال رکھتے ہیں

گھر میں ثاقبؔ یہی خزانہ ہے
ہل، درانتی، کدال رکھتے ہیں

غزل

ایک بے جوڑ سی بے ربط، کہانی، کب تک
اے مصور وہی تصویر پرانی کب تک

کسی سفلے سے کبھی دل کی حقیقت مت کہہ
کسی چھلنی میں ٹھہر سکتا ہے پانی کب تک

دیکھیے، رہتے ہیں، نعروں کی رجز خوانی میں
ایک دوجے سے جدا حرف و معانی کب تک

جو بھی منظر ہو اُسے ڈوب تو جانا ہے کبھی
تا کجا موسمِ غم، شام سہانی کب تک

کوئی کن رس ہی نہ تھا گیت سناتے کس کو
یاد ہی جب نہ رہے، یاد دھانی کب تک

نام ہجرت کا نہ بدنام کیا کر اے دوست
یہ بتا اب ہے نئی نقل مکانی کب تک

آپ کی اپنی بھی پہچان کوئی ہے کہ نہیں
کام آئے گی یہ آبا کی نشانی کب تک

یہ چرایا ہوا سامانِ عزیمت کیا ہے!
یہ خریدی ہوئی بے سطح جوانی کب تک

ہم ترے وصل کی خوشبو میں نہائے ہوئے تھے
ہم سے لڑتی شبِ ہجراں کی گرانی کب تک

دشت میں وہ رخِ زیبا ہی نہیں تو امجد
ایسے دیسوں کے لیے خاک اُڑانی کب تک

امجد اسلام امجد

غزل

انصاف میں در آئے سیاست تو تباہی
شامل ہو محبت میں ضرورت تو تباہی

ہو سکتا ہے ہر شکلِ ہزیمت کا مداوا
ہاتھوں سے گیا نقدِ حمیّت تو تباہی

جی سکتے ہیں ہر روگ ترے لوگ وفا میں
سنبھلی نہ اگر تجھ سے معیشت تو تباہی

پسپائی کی حکمت ہو ضروری تو گوارا
سوچوں میں اترنے لگے رجعت تو تباہی

مت بھول خطاؤں کی تلافی کے تقاضے
ابھرے نہ کوئی عکسِ خجالت تو تباہی

احساس ہو باقی تو ہے پہچان سلامت
تخفیف میں محسوس ہو راحت تو تباہی

ہو عجز تو پاتا ہے نمو نخلِ بصیرت
رائے میں رچی بوئے رعونت تو تباہی

سچ چھوڑ کے اندر کا، فقط فیشنی سطریں
باقی نہ رہی لفظ کی حرمت تو تباہی

عالی یہ وہ لمحہ ہے کہ ہے نقش بہ دیوار
کی اب نہ اگر خود سے بغاوت تو تباہی

جلیل عالی

غزل

کچھ کام کر سکی نہ دوا قصہ مختصر
لب پر ہے اب تو حرفِ دعا قصہ مختصر

میں نے بھی اُس کی بات نہ مانی برا کیا
ہوتی رہے گی مجھ سے خطا قصہ مختصر

میزانِ عدل روبرو رکھی گئی مرے
منصف سنا رہا ہے سزا قصہ مختصر

یوں بھی تو سر اُٹھا کے رہی اُس سے گفتگو
ہوتا رہا وہ مجھ پہ خفا قصہ مختصر

برپا ہوا ہے نالہ و فریاد ہر طرف
دل میں ہوا نہ شور بپا قصہ مختصر

میں ہی ہدف بنا ہوں کوئی اور ہو نہ ہو
چلنے کو اب ہے تیرِ قضا قصہ مختصر

تر دامنی میں کوئی برابر ہے یا نہیں
کرتا رہا وہ مجھ پہ جفا قصہ مختصر

جو ہمسفر تھے آج وہ مجھ سے جدا ہوئے
پایا مزاج اُن کا جدا قصہ مختصر

یاد آ گیا کہ اس کا پسینہ گلاب تھا
اُکھڑی ہوئی ہے اُس کی ہوا قصہ مختصر

حسن عسکری کاظمی

غزل

بے صدا آنکھوں کے نم سے ہوں
شمع خاموش تیرے غم سے ہوں

غیر مشروط تیرے ساتھ رہوں
میں تو قائم اسی بھرم سے ہوں

ہیں رگ جاں میں بجلیاں ہر دم
کسی آتش بجاں کے دم سے ہوں

سر کٹا کے جو سرنگوں نہ ہوا
کربلا کے میں اس علم سے ہوں

بجھتی آنکھوں میں روشنی پھوٹی
ذی حشم ہوں کہ ذی حشم سے ہوں

ہو چکا ہوں میں تب سے لب بستہ
جب سے وابستہ اس کے غم سے ہوں

ہے نشیب و فراز میں نشہ
متلاطم جو زیر و بم سے ہوں

حادثوں نے شعور بخشا ہے
متوازن میں بیش و کم سے ہوں

یہ تو احساس کی کرامت ہے
پر مسرت میں چشم نم سے ہوں

بے کراں فاصلے سمٹتے گئے
سیر منزل میں خوش قدم سے ہوں

پاک طینت ریاض کیوں نہ رہوں
دل حرم سے ہے میں حرم سے ہوں

سید ریاض حسین زیدی

غزل

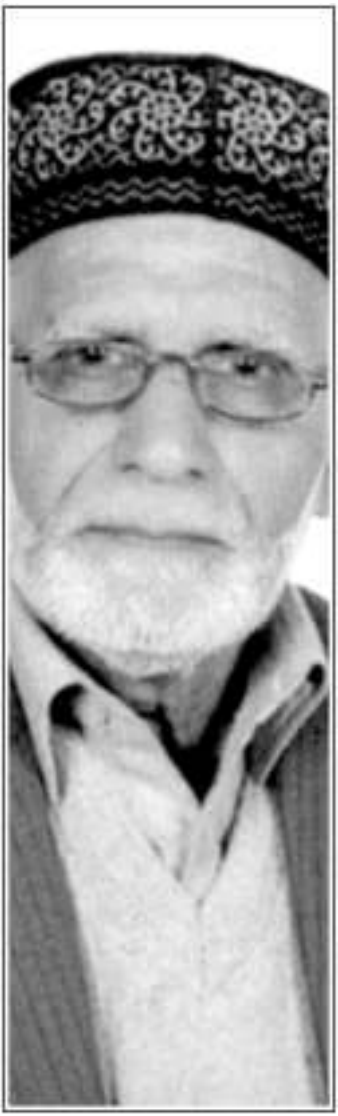

عمر بھر صورتِ ناگہاں میں رہے
اِس زمیں پر نہ ہم آسماں میں رہے

تیرنے کو ہی نکلے نہ ڈوبے کہیں
ولولے دِل کے سب امتحاں میں رہے

کوئی آغاز و کردار سمجھا نہیں
بس غنیمت ہے ہم داستاں میں رہے

موسمِ ہجر کی تیز تر دھوپ میں
یاد کے پرسکوں سائباں میں رہے

ہر ہدف سے رہے بے خبر عادتاً
تیر بن کے سے کی کماں میں رہے

رہبروں کے بھروسے ہی بھٹکا کیے
جب مسافر بنے کارواں میں رہے

آفریں بخت اپنا تھا آکاش پر
جب تلک صحبتِ مہ وشاں میں رہے

رشید آفرین

غزل

سارے منظر بھیگ چکے ہیں بارش میں
سات سمندر بھیگ چکے ہیں بارش میں

بابا تو آرام سے قبر میں سویا ہے
اُس کے مجاور بھیگ چکے ہیں بارش میں

تان دیا ہے اپنا جال شکاری نے
چڑیوں کے پَر بھیگ چکے ہیں بارش میں

اِک اَن دیکھی آگ جلائے جاتی ہے
اندر باہر بھیگ چکے ہیں بارش میں

آگے کا ہے سارا سفر ڈھلوانوں کا
اور سب پتھر بھیگ چکے ہیں بارش میں

اُس کی یاد کا نَم آنکھوں میں اُترا ہے
ہم تو یکسر بھیگ چکے ہیں بارش میں

جھیل میں بھی شاید طغیانی آئی ہو
دونوں کبوتر بھیگ چکے ہیں بارش میں

چھت پر جا کر سونا چاہا تھا ہم نے
لیکن بستر بھیگ چکے ہیں بارش میں

آندھی نے مٹی میں مِلا دیں دستاریں
سرداروں کے سر بھیگ چکے ہیں بارش میں

بندہ پرور، چھت کے نیچے جانے دو!
بندہ پرور، بھیگ چکے ہیں بارش میں!

کوزہ گر کے خون پسینے کی تخلیق
سارے پیکر بھیگ چکے ہیں بارش میں

اب تو تھوڑی دیر کو فائر بندی ہو
دونوں لشکر بھیگ چکے ہیں بارش میں

چھلنی چھلنی چھت ہے اپنے گھر کی نسیمؔ
گھر کے اندر بھیگ چکے ہیں بارش میں

نسیمِ سحر

غزلیں

آنکھ میں رنگ نئے خواب کے بھرنے لگے ہو
تم نے کیا دیکھا ہے جو ایسے سنورنے لگے ہو

یہی انجام نظر آتا تھا اِس عجلت کا
دل میں اُترے نہیں، نظروں سے اُترنے لگے ہو

تم نے پانا ہے کسی کو کہ گنوانا خُود کو
کوچۂ عشق سے جو روز گذرنے لگے ہو

نہ سہی ہم سے محبت، چلو نفرت ہی سہی
خُوش ہُوئے ہم کہ کوئی کام تو کرنے لگے ہو

پہلے پہلے تو شکایت بھی نہیں کرتے تھے
کُھل گئے ہو تو اَب الزام بھی دھرنے لگے ہو

آ گیا ہے جو تمہیں ڈھنگ سے جینا خاورؔ
ایسا لگتا ہے کسی شخص پہ مرنے لگے ہو

خاور اعجاز

وہ آ کر اِتنی باتیں کر گیا ہے
کہ جی اَب گفتگو سے بھر گیا ہے

یہی ہونا تھا اِس پاگل کے ہاتھوں
کہ ہم جیتے ہیں اور دل مر گیا ہے

گلی کوچوں میں ہے وہ ہُو کا عالم
جو بولا ہے وہ خُود سے ڈر گیا ہے

ابھی عزّت بچا سکتے ہو اپنی
ابھی تو صرف مال و زر گیا ہے

قدم رکھا درِ الفت پہ جس نے
مآلِ کار اُس کا سر گیا ہے

نہ دو آواز خاورؔ کو لحد میں
تھکا ہارا ابھی تو گھر گیا ہے

غزلیں

نئی رُتوں کے لیے کس قدر اُداس ہوئے
وہ برگِ زرد، کہ ٹُٹ پاتھ کا لباس ہوئے

جہیز جیت چکا تھا مرے مقدر کو
محبتوں کے اٹل فیصلے، قیاس ہوئے

کہ لوگ مانگ رہے تھے دعائیں بارش کی
سُنے جو اَبر کے احکام، بدحواس ہوئے

میں دیکھتا رہا ہر شخص کے روّیے کو
کچھ آشنا تھے، بتدریج ناشناس ہوئے

جو ایک عمر سے مشغولِ جنگ ہیں مجھ سے
وہ تجربے ہی مرے فکر کی اَساس ہوئے

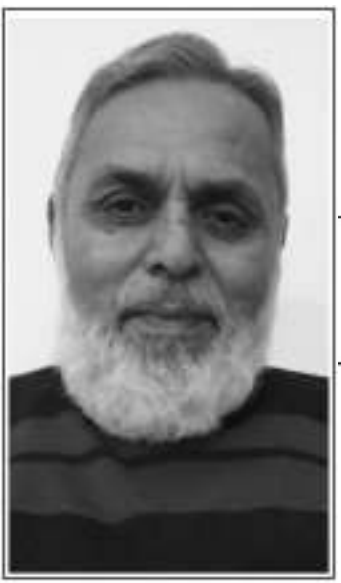

محمد انیس انصاری

قحط زدہ نسلوں کے بنجر ہاتھوں کی ریکھاؤں میں
بوڑھا مستقبل بیٹھا ہے جس آلودہ چھاؤں میں

ابھی تو یہ ننھا سا پودا کتنے ہی دُکھ جھیلے گا
ابھی تو لمحوں کا اِک دریا، حائل ہے برکھاؤں میں

ہم، کہ اپنے ٹوٹے پھوٹے جسموں کے خوشہ چیں لوگ
لمحہ لمحہ اُتر رہے ہیں عبرت خیز کتھاؤں میں

آوازوں کا شور یکا یک سناٹے میں ڈوب گیا
جانے کیا کیا فیصلے باہم طے پائے میگھاؤں میں

ہم نے اپنے اپنے چہرے غزلِ ذات میں ڈھانپ لیتے
تم بھی وہ گہنہ ریشتے نہ ڈھونڈو اب مَن بھاؤں میں

غزل

بنیں جس گھڑی محبت خدوخالِ آشنائی
نہیں بھولتے کسی کو مہ و سالِ آشنائی

یہی خواب ہے سفر میں رہے تو سدا نظر میں
ہمیں جس طرف اُڑائیں پر و بالِ آشنائی

کریں جاں نثار تجھ پر کہ فدا ہیں یار تجھ پر
جنھیں علم ہے گراں ہے زر و مالِ آشنائی

سبھی تجھ پہ مر رہے ہیں یہ گلہ بھی کر رہے ہیں
تجھے پاسِ دوستی ہے نہ خیالِ آشنائی

کبھی اس سے واسطہ ہے کبھی اس سے رابطہ ہے
ترے زاویے سے ٹھہرا ہے کمالِ آشنائی

کسی رخ سے تھے نہ غافل رہے یاد سب مراحل
ہمیں ورنہ مار دیتا یہ مآلِ آشنائی

نہیں ضبط کو گوارا کھلے تجھ پہ دکھ ہمارا
سو بیان تک نہ پہنچا غمِ حالِ آشنائی

گلزار بخاری

غزل

منزل سے نابلد ہے میں جس قافلے میں ہوں
لیکن میں ایک ضابطے اک قاعدے میں ہوں

مجھ میں گزر رہا ہے کہ ہے چارسو مرے
مجھ میں ہے واقعہ کہ میں خود واقعے میں ہوں

ہے پوری کائنات سے گرچہ وسیع تر
لیکن جو کھنچ گیا ہے اسی دائرے میں ہوں

پرکارِ وقت مجھ سے یہ کیسا مذاق ہے
نقطے نہ دائرے نہ کسی زاویئے میں ہوں

ثاقب! ہوں حاشیئے میں کبھی متن میں کبھی
گویا کسی غریب کے میزانیئے میں ہوں

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بن کر سپردگی کا تصور پگھل کے آ
مجھ تک تو اپنے جسم کے شعلوں پہ چل کے آ

غزل

نہ اُس کو حسن کیوں مغرور کر دے
جو اک جلوے سے سرمہ طور کر دے

ہمیں تو عرض کرنی تھی سو کر دی
وہ گر چاہے تو نامنظور کر دے

بتا میں کیا کروں اس زندگی کا
جو مرنے کے لیے مجبور کر دے

نقاب رخ الٹ کر وہ پری رو
جسے دیکھے بلائیں دور کر دے

تو ایسا خواب ہی کیوں دیکھتے ہو
جسے ہر صبح چکنا چور کر دے

وہ نسخہ ہم کو بھی بتلاؤ راحت
جو گھر بیٹھے ہوئے مشہور کر دے

راحت سرحدی

غزل

کم نہیں ہے جو فصیلِ شہر سے معیار میں
دیکھنا میں در بناؤں گا اُسی دیوار میں

حسن وہ شاید مرے اندر کہیں موجود ہے
ڈھونڈھتا ہوں میں جسے تیرے لب و رخسار میں

دیکھتے ہی دیکھتے سارے حجاب اُٹھ جائیں گے
کوئی شدّت بھی تو آئے خواہشِ دیدار میں

احتیاطاً تیری سانسیں بھی چُرا کے لائی ہے
ورنہ کیا رکھا تھا تازہ پھول کی مہکار میں

کیا شکایت مجھ سے گر سائے گنوا کر آ گیا
تو نے ہی بھیجا تھا مجھ کو دھوپ کے بازار میں

شاہ کی مرضی پہ ہے انجام اچھا یا بُرا
مجھ کو جو کہنا تھا طالب کہہ دیا دربار میں

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جاگ رہا ہے تُو مجھ میں
یا ، تیری خو بو مجھ میں

غزل

اقبال سروبہ

اک جہاں آج ترے حلقہ تسخیر میں ہے
اور الجھا ہوا اب تک کوئی تدبیر میں ہے

اپنے اشعار پہ میں نے جو کبھی غور کیا
اک معانی کا سمندر مری تحریر میں ہے

میں نے تاریخ کے اوراق کو دیکھا تو کھلا
اک شہادت رہ الفت مری تقدیر میں ہے

سرد ہو گا نہ کبھی جذبہ حب الوطنی
کسقدر ظلم بپا وادی کشمیر میں ہے

چاند تاروں میں نہ پھولوں میں کہیں آئی نظر
وہ کشش جو رخ محبوب کی تنویر میں ہے

جس کو دیکھو وہ کھنچا آتا ہے ڈوری کے بغیر
کیسا جادو یہ تری زلف گرہ گیر میں ہے

میں نے اس واسطے دل ہی میں بسا رکھی ہے
"کچھ مرا پیار بھی شامل تری تصویر میں ہے"

ہائے یہ تاج محل اور یہ شاہی دربار
کس کا اقبال لہو جانیے تعمیر میں ہے

غزل

جشن برپا ہیں راجدھانی میں
لوگ ڈوبے ہوئے ہیں پانی میں

گھیرے ہم کو ہے بارشی سیلاب
غرق رہبر ہیں بدزبانی میں

روز تکتے ہیں ڈوبتا سورج
پھر بھی رہتے ہیں خوش گمانی میں

پانی زنجیر بن گیا جن کی
موت ان کو ملی نشانی میں

اَب تو جینا بھی گھٹ کے مرنا ہے
موت بہتر ہے اس گرانی میں

ہو گئے ہیں برہنہ لیڈر بھی
ایک دوجے کی کھینچا تانی میں

مال و اسباب اور مکان و مکیں
بہہ گئے تیز و تند پانی میں

یاں یزیدی بھی ہیں حُسینی بھی
کچھ بھی بدلا نہیں کہانی میں

ہم نے تھاما علم ہے غازی کا
موت آئے گی حق بیانی میں

کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا ہے
سب کے دلبر میں، سب کے جانی میں

نیکی دریا میں ڈالنا نہ عقیل
موت ہے اس کی اب روانی میں

عقیل رحمانی

غزلیں

در ایجاب کھلنا چاہتا ہے
پرانا خواب کھلنا چاہتا ہے

وہاں ہیں سب کے سب کچے گھروندے
جہاں سیلاب کھلنا چاہتا ہے

تو پھر یہ بادلوں کی اوٹ کیسی
اگر مہتاب کھلنا چاہتا ہے

مچی ہے کھلبلی سوچوں میں کیسی
یہ کیسا باب کھلنا چاہتا ہے

مکمل ہو چکی ہے گویا ہجرت
بندھا اسباب کھلنا چاہتا ہے

وہ یارِ کم نما پرواز مجھ سے
درونِ خواب کھلنا چاہتا ہے

یعقوب پرواز

ناشنیدہ ہی سہی نالش مری
مانتی ہے ہار کب کوشش مری

کیا ہوا اے عالمِ امکاں تجھے
دل ہی دل میں رہ گئی خواہش مری

اب سنورنے سے رہا خستہ مکاں
اب نہ کیجے فکرِ آرائش مری

سطح بینوں کی نظر میں جرم ہے
خیر میں لپٹی ہوئی سازش مری

بزم دل میں بار پائے گی کہاں
آنکھ میں سہمی ہوئی خواہش مری

جی رہا ہوں بس اِسی امید پر
ہے ابھی اُس دل میں گنجائش مری

غزلیں

یہ کلیہ قاعدہ ہم عشق میں تسلیم کرتے ہیں
محبت ضرب کھاتی ہے اگر تقسیم کرتے ہیں

نکلنے کو بہت اوپر نکل سکتے تو ہیں لیکن
شجر اس بوڑھے برگد کی بڑی تعظیم کرتے ہیں

کوئی قارون کی دولت نہیں جو خرچ ہو جائے
ہم اپنے نام تیرے ہجر کی اقلیم کرتے ہیں

جدائی جان لیوا ہے مگر کارِ محبت میں
تری خاطر ہم اپنے آپ کو دو نیم کرتے ہیں

مسعود احمد

گلاب نیند میں ہے ماہتاب نیند میں ہے
پڑھیں تو کیسے پڑھیں وہ کتاب نیند میں ہے
خدا نے رات بنائی ہے صرف سونے کو
یہ دن کا جاگا ہوا آفتاب نیند میں ہے
کبھی اٹھا بھی تو محشر کے بعد اٹھے گا
ابھی تو یہ دلِ خانہ خراب نیند میں ہے
سمٹ بھی سکتا ہے کچے گھڑے کے پیندے میں
چناب ہے کہ سلگتا سراب نیند میں ہے
وہ اٹھ گیا تو کوئی اور گل کھلائے گا
سکوں سے بیٹھ ابھی اضطراب نیند میں ہے

ستارے ہی ستارے جگمگا اٹھتے ہیں رستے میں
لہو کی لو سے جب یہ روشنی تجسیم کرتے ہیں

خدا کی حمد میں مصروف یہ ننھے پرندے بھی
محمد مصطفےٰ کے دین کی تفہیم کرتے ہیں

انہیں کی مٹھیوں میں بند سب کے سب ضوابط ہیں
وہ اپنی مرضی و منشا سے ہر ترمیم کرتے ہیں

ہمارے سونے سے بیدار ہی نہ ہو جائے
ابھی وہ جاگتی آنکھوں کا خواب نیند میں ہے
ہمیں یہ لگتا تو تھا محتسب چوکنے ہیں
مگر یہ سچ کہ ابھی احتساب نیند میں ہے
ہمارے نامۂ اعمال کے خلاصے میں
گناہ جاگ رہے ہیں ثواب نیند میں ہے

غزلیں

جو مطمئن نہ ہوا مانگ کر معافی مَیں
کروں گا جاں کے عوض رنج کی تلافی مَیں

گزر گیا ہوں ترے انتظار سے لیکن
نکال پایا نہیں راہِ انحرافی مَیں

یہ خود فریبی مجھے ناگزیر کہتی ہے
حقیقتاً تو مرے دوست، ہوں اضافی مَیں

کوئی نکال سکوں اتفاق کا رستہ
زبان بولتا رہتا ہوں اختلافی مَیں

تمام عمر مجھے بخت کوستا رہا ہے
چلا خود اپنی ہی تدبیر کے منافی مَیں

اکرم جاذب

دیکھنے میں تو مکاں ڈوب گئے پانی میں
کتنے خوابوں کے جہاں ڈوب گئے پانی میں

بے بسی دیکھتے امید بھری آنکھوں کی
لے کے احساس زیاں ڈوب گئے پانی میں

حال کے ہی نہیں ارمان زمیں بوس ہوئے
صبحِ فردا کے نشاں ڈوب گئے پانی میں

کتنی چیخوں کا کسی نے بھی لگایا نہ سراغ
کتنے فریاد و فغاں ڈوب گئے پانی میں

بچوں، بوڑھوں کو بچاتے ہوئے طغیانی سے
میں نے دیکھا کہ جواں ڈوب گئے پانی میں

قطرے قطرے کو ترستے رہے جو دشت نشین
وقت لکھے گا یہاں ڈوب گئے پانی میں

غزل

لنگر انداز جہازوں سے اُدھر دھند سی ہے
آج رہنے دو سمندر کا سفر، دھند سی ہے

کیسے رستے کا تعیّن کرے کوئی آخر
زندگی چھوڑ گئی مجھ کو جدھر دُھند سی ہے

کوئی امکان بظاہر تو نہیں بارش کا
لیکن اُس پار پہاڑوں سے اُدھر دھند سی ہے

لمحے بھر کو تو ٹھہر اے مرے جانے والے
خشک ہونے دے مرا دیدۂ تر دُھند سی ہے

ایسا ٹھہراؤ مقدّر کا ہے پتھر کی طرح
اپنی تقدیر میں تاحدِ نظر دھند سی ہے

حریم حیدر

اجنبی دیس میں اک جھیل ہے، میں ہوں تُو ہے
اس سے آگے بھی تھا کچھ خواب مگر دھند سی ہے

مُڑ کے دیکھوں گا تو پتھر کا نہ ہو جاؤں کہیں
اور آگے بھی سرِ راہگزر دھند سی ہے

کیسے سمجھے گا حریم آپ کے اشعار کوئی
شیشۂ لفظ و معانی پہ اگر دھند سی ہے

غزل

جسارت خیالی

بھوک ہے تشنگی ہے مرے شہر میں
موت ہی زندگی ہے مرے شہر میں

سچ جہاں بولنے کی اجازت نہیں
کیسی آزادگی ہے مرے شہر میں

جب سے دولت یقیں کی ملی خاک میں
اب سراسیمگی ہے مرے شہر میں

اب کے بدلا ہے یوں زندگی کا چلن
خوب آوارگی ہے مرے شہر میں

نام فرزانگی کا کہیں بھی نہیں
صرف دیوانگی ہے مرے شہر میں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

غزل

دل میں جب سے وہ چاند چہرہ ہے
میرے اطراف میں اجالا ہے

اس سے رشتہ نہیں کوئی ، لیکن
جانے ، اپنا سا کیوں وہ لگتا ہے

ایک مجنوں ہے ، دوسرا میں ہوں
درد ، دونوں کا ایک جیسا ہے

دل کے گلشن میں ، ایک مدت سے
موسمِ ہجر کا بسیرا ہے

دل مرا باغ باغ ہے تب سے
حال ، جب سے کسی نے پوچھا ہے

یاد اپنی اسے دلانے کو
عید کے روز ، پھول بھیجا ہے

مہ جبینوں کے درمیاں ، شوکتؔ
تیرے شعروں کا خوب چرچا ہے

شوکت محمود شوکت

غزل

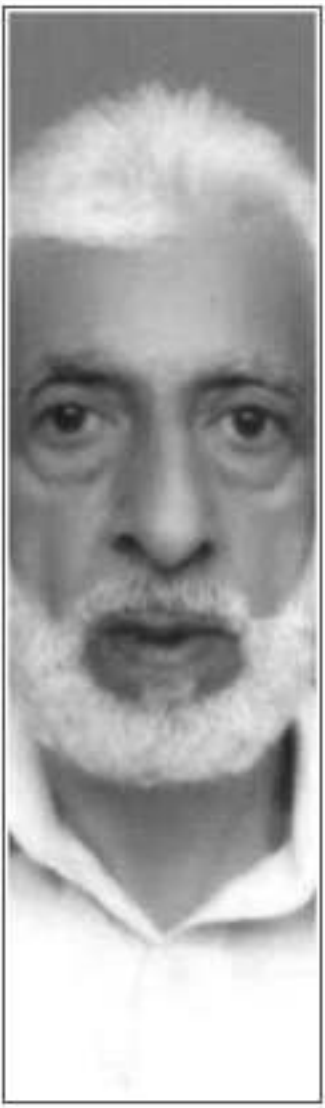

ایک دوجے سے لڑیں ہم خون کی ندیاں بہیں
دشمنوں میں پک رہی ہیں یہ بھیانک سازشیں

زندگی کیسے گزاریں اور وہاں کیسے رہیں
ہوں جہاں پر ہر کسی کی نامکمل خواہشیں

دیکھنا ہوں گی مقدر نفرتیں اُس کا نصیب
ختم کر کے جو گیا ہے سب دلوں سے الفتیں

جرم اُس کی چاہ کا سر زد نہیں تنہا ہوا
اور بھی کافی ہوئی ہیں ہم سے سرزد لغزشیں

اُس کے آنے کی خبر جب سے مجھے موسم نے دی
گل کی مانند کھل رہی ہیں میرے دل میں حسرتیں

نعت کا اک ایک مصرع ہو رہا ہے اپنے آپ
کس قدر ہیں مجھ پہ لوگو رحمتوں کی بارشیں

حشر میں بھی ہم خطا کاروں کا رکھیں گے بھرم
روزِ اول سے بُجوی ہیں جن سے شاہدؔ نسبتیں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

لگتا ہے اک زمین نے کھویا تھا آسماں
اُس نوجواں کی موت پہ رویا تھا آسماں

نوحہ کناں تھے بستی کے انس و شجر سبھی
اشکوں سے بادلوں نے بھگویا تھا آسماں

نظارے منعکس تھے حسیں چشمِ ناز میں
آنکھوں کی جھیل ہی میں ڈبویا تھا آسماں

نکلے تھے ہم بھی چشمۂ پُرنور دیکھنے
شفاف پانیوں نے سمویا تھا آسماں

جس شام ملنے آیا تھا وہ پیکرِ جمال
دھرتی دلہن بنی تھی ، نرویا تھا آسماں

معراج میں حضور وہاں سے گزر گئے
جن گردشوں سے رب نے بلویا تھا آسماں

کس شان سے ہیں اب بھی نگینے جڑے ہوئے
کن موتیوں سے حق نے پرویا تھا سماں

آفت تھی ناگہانی کوئی شِست میں رضاؔ
دھرتی ہی پُرسکوں تھی نہ سویا تھا آسماں

رضا اللہ حیدر

غزل

پرتوِ غم کوئی چھپاتا ہے
ہنسنے والا نمی چھپاتا ہے

ہر تماشا برہنگی میں یہاں
ایک بوسیدگی چھپاتا ہے

کس طرح کوئی ان مکانوں میں
اپنی دیوانگی چھپاتا ہے

زندہ رہنے کے سارے حیلوں میں
آدمی خود کُشی چھپاتا ہے

ہم سے اعلان چاہتا ہے وہ
خود کو جو سب سے ہی چھپاتا ہے

شب جہاں تیرگی نگلتی ہے
دن وہاں روشنی چھپاتا ہے

اپنی غزلوں میں اپنی نظموں میں
کوئی ناگفتنی چھپاتا ہے

کم نگاہی مری بھی ہے لیکن
راستہ بھی گلی چھپاتا ہے

دل لگی میں شکیل جاذب بھی
اپنی دل بستگی چھپاتا ہے

شکیل جاذب

غزلیں

مرا دل بھر گیا ہے اس جہاں سے
مرے مالک ملادے رفتگاں سے

زمیں پر آگیا تھا تیری خاطر
مرا رشتہ ہے اب تک آسماں سے

بہاروں سے مرا دل بھر گیا ہے
سو اپنی دوستی ہے اب خزاں سے

گرایا جس نے ہے مجھ کو زمیں پر
یہ تیر آیا ہے یاروں کی کماں سے

یہاں پر ہر جگہ ظلم و ستم ہے
نہیں الفت مجھے اس خاکداں سے

محبت، رزق، شہرت اور عزت
مجھے ملتے ہیں تیرے آستاں سے

ظہورِ شاہ میں تعجیل کر دے
کہ امیدیں ہیں اب شاہِ زماں سے

سید فرخ رضا ترمذی

یہاں پر سانحہ کیسا ہوا ہے
گلوں کا رنگ کیوں بدلا ہوا ہے

نشاں منزل کا اب ملنا نہیں ہے
مسافر اس طرح بھٹکا ہوا ہے

تمہاری آنکھ سے ٹپکا جو آنسو
ہماری آنکھ میں ٹھہرا ہوا ہے

خوشی بھی اب خوشی لگتی نہیں ہے
تمہارے غم نے یوں باندھا ہوا ہے

نہیں بھولیں گے اب برسوں تلک یہ
تماشا اس برس ایسا ہوا ہے

کئی عشروں سے ہے اک جیسا موسم
ہمارے دیس میں یہ کیا ہوا ہے

غزل

غیض وغضب سے ہر سو اپنی دھاک بٹھائی پانی نے
قریہ ، قریہ ، بستی ، بستی آگ لگائی پانی نے

آہ وفغاں پہ کان دھرے نہ اس سیلابی ریلے نے
ڈوبنے والے ڈوب گئے نہ سنی دہائی پانی نے

روکھی سوکھی کھا کر یہ جو میٹھے سپنے دیکھتے تھے
ان ہاری مزدوروں کی بھی ہنسی اڑائی پانی نے

سندھ، بلوچستان میں اس نے لاکھوں گھر برباد کئے
اور جنوبی پنج آبے میں انت مچائی پانی نے

پربت کے سارے چشمے بھی اس طوفاں کے ساتھ ہوئے
پھر شور میں بپھرے طوفاں کے آواز ملائی پانی نے

بی بی نانی پل ٹوٹا تو سارے ربط ہی ٹوٹ گئے
ہر رستے، ہر موڑ پہ اک دیوار اٹھائی پانی نے

پانی اور مٹی نے مل کر کیسا کھیل رچایا ہے
مٹی کو مٹی نے روندا ، دوڑ لگائی پانی نے

تسنیم کوثر

غزلیں

جینا اک بیزاری ہے تو ایسا کرتے ہیں
خوفِ مرگ پہ مل کر ٹھٹھا کرتے ہیں

اک کشتی کے خواب میں خود کو رکھ کر ہم
عمر کی ٹھہری موج کو دریا کرتے ہیں

اپنی اپنی پیاس لیے چوراہے میں
سیرابی کا روز تماشا کرتے ہیں

اپنے آپ سے چھپ کر بیٹھنے والے ہم
کب منہ زور دنوں سے الجھا کرتے ہیں

چھوٹی بات ہے پر یاروں سے کہنی ہے
لکھنے والے اکثر چربہ کرتے ہیں

شہد بھری باتوں کا ساغر ٹوٹ گیا
کافی سے ہونٹوں کو کڑوا کرتے ہیں

پتھر بھی ، اور نام کی تختی لکھوا لی
وقت سے پہلے کام کو پورا کرتے ہیں

قیوم طاہر

تجھ پھول کو اب ہاتھ لگانے سے گیا میں
اک باغِ بدن تھا جہاں جانے سے گیا میں

اک دُور کے بوسے پہ گزارا کیا جائے
اب چھونے سے اور ملنے ملانے سے گیا میں

تجھ بادِ محبت سے شکایت نہیں کرنی
اب اور چراغوں کو جلانے سے گیا میں

کچھ لمحے وراثت میں تو کچھ لان میں گزرے
اب ڈیرہ سجانے سے، ٹھکانے سے گیا میں

اک خوف گزرتے ہوئے ہونٹوں میں بسا ہے
اب شعر کوئی سننے سنانے سے گیا میں

کم ظرف مری آنکھ نے شرمندہ کیا ہے
رنگوں سے بھرے خواب چھپانے سے گیا میں

طاہر میں نیا نقشہ بنانے میں لگا ہوں
وہ شہر پرانا تو بسانے سے گیا میں

غزل

سعد اللہ شاہ

اک رہنما کہ چل رہا ہے دشمنوں کی چال
مذہب ہے اس کے واسطے گویا کہ ایک ڈھال

کہتے ہیں لوگ چھوڑیے ان کو نہ چھیڑیے
یعنی کہ دیکھتے رہو تہذیب کا زوال

لائیں کہاں سے سعدی کہ لکھے حکائتیں
آئے کہاں سے رازی کہ پوچھے کوئی سوال

بے ساختہ لبوں پہ مچلنے لگا درود
اک کام ہو گیا تھا ہمارے لئے محال

بے حال ہو کے رہ گئے فردا کے شوق میں
ماضی سے کوئی آ کے نکالے ہمارا حال

اس کا مزاج اور تھا میرا مزاج اور
وہ سر تا پا جنوب تھا میں سر بسر شمال

اس نے تو سب سے پہلے کیا میرا پتہ صاف
میرا یہ وہم تھا اسے میرا نہیں خیال

میرے وطن کو کھا گئے دو تین خاندان
اور ان کو لانے والے ہیں ان سے بڑا وبال

اے سعد انتخاب پہ کیا تبصرہ کریں
طوطے نکالتے ہوں جہاں ہر کسی کی فال

غزل

فشارِ خوں کی ہر دم تُند طُغیانی میں رہتے ہیں
ہمارے دل کسی وحشت کی ویرانی میں رہتے ہیں

سدا تشنہ گُناہوں کی فراوانی میں رہتے ہیں
نظر کے پارسا بھی شہرِ عُریانی میں رہتے ہیں

کرے گی کامیابی کیا ہمیں آپے سے باہر ہم
کئی ناکام لمحوں کی پشیمانی میں رہتے ہیں

اُدھر تُم ہو کہ سُلطانوں کو دربانی پہ رکھا ہے
اِدھر ہم ہیں کہ دربانوں کی سُلطانی میں رہتے ہیں

رکھی ہیں جن کی تقدیریں لکیروں اور ستاروں میں
جو لافانی تو ہیں، پر عالمِ فانی میں رہتے ہیں

مہ و انجم چلو خورشید کے پَرتو سے جگمگ ہیں
مگر جگنو نجانے کس کی تابانی میں رہتے ہیں

دلوں کی خواہشیں کتنی دُعاؤں تک نہیں پہنچیں
ادھورے کتنے سجدے اب بھی پیشانی میں رہتے ہیں

ہمیں چھوڑی ہوئی جنت یونہی ملنی نہیں واجد
خُدا دیکھے گا آخر کیسے آسانی میں رہتے ہیں

واجد امیر

غزل

جب ناچ دکھاتی ہے مری عمر کی رادھا
جھڑتا ہے مہ و سال کا اس تن سے برادہ

اس جنگ میں ہاتھی بھی ہیں گھوڑے بھی ہیں لیکن
شہ مات کو میں آگے بڑھاؤں گا پیادہ

میں آئنہ خانے کی ادا سیکھ رہا ہوں
زنگار تو ہوتا ہے نظر آتا ہے سادہ

یوں ہجر کو سہنا بھی تو آسان نہیں ہے
سنتے ہیں کہ ہے وصل کا آزار زیادہ

اک روز سرِ دشت مجھے پھینکنا ہو گا
اک عمر سے پہنا ہوا وحشت کا لبادہ

مدت سے تری آنکھ کی جھیلوں سے پرے ہوں
مدت سے نہیں میں نے چھوا عنبر و بادہ

وہ شب کی فصیلوں پہ سلگتی ہوئی آنکھیں
وہ شام کی دہلیز پہ رکھا ہوا وعدہ

ہر شام اداسی میں گزر جاتی ہے شاہد
ہر شام ہی کرتا ہوں میں جینے کا ارادہ

افتخار شاہد

غزل

تیری یادوں کی دُنیا سے عُقبا میں داخل ہوئے
آج ماضی سے نکلے تو فردا میں داخل ہوئے

اِس سے اچھا تھا اُس کے مضافات میں گھومنا
کس لیے آپ شہرِ تماشا میں داخل ہوئے

عشق میں ہو نہ پائے سبک رُوح پوری طرح
خود سے نکلے تو اس کے سراپا میں داخل ہوئے

وقت میں داخلے کی کوئی شرط ہے ہی نہیں
جوق در جوق سب روزمرہ میں داخل ہوئے

لوگ مابعد جدّت میں پہنچے اساطیر سے
پھر وہاں سے نئی دیومالا میں داخل ہوئے

ایک موسم سے اور ایک موسم میں رکھا قدم
ایک پُروا سے اور ایک پُروا میں داخل ہوئے

کیسی کیسی شعاع ایک اندھیرے سے خارج ہوئی
کیسے کیسے طلسمات اشیا میں داخل ہوئے

شام آئی تو دن کے نگر سے نکل آئے ہم
چاند نکلا تو راتوں کے صحرا میں داخل ہوئے

دل میں اُترے کسی لاپتہ لہر کے کھوج میں
موج کی بازیابی کو دریا میں داخل ہوئے

گھپ اندھیرا تھا، جب روشنی کا دریچہ کھُلا
ہم وہاں سے نئی ایک دُنیا میں داخل ہوئے

شاہد ماکلی

غزلیں

بھلے میری آنکھیں وہ تر کر گیا ہے
مگر دل میں میرے وہ گھر کر گیا ہے

مرا خط تھا اور پھر تھما کے عدو کو
یہ کیسی خطا نامہ بر کر گیا ہے

چلو میرے بھائی غزہ کی طرف بھی
اشارہ مجھے اک نڈر کر گیا ہے

وہ شہ زادی ہو یا وہ آیا ہو اس کی
جو دنیا میں آیا وہ مر کر گیا ہے

گھما کے مجھے عشق وادی میں احمد
محبت کی چوٹی وہ سَر کر گیا ہے

علی رضا احمد

پہلے اِک شاہ کا دیوان بنے
آج ہم اپنے ہی مہمان بنے

تیری حرمت ہی کی خاطر ہم تو
ہر کسی جنگ کا میدان بنے

چھوڑ آئے تھے اُنہیں شہروں میں
دل کے جنگل جبھی سنسان بنے

جو رکھے دل کا تمدن قائم
پہلے تہذیب کا یونان بنے

عقل تو پہلے ہی نایاب ہوئی
یاں تو ایسے نہیں بحران بنے

غزل

درد لپٹا ہے ہر اک خواب کی تعبیر کے ساتھ
زخم الجھا ہے مرے پاؤں کی زنجیر کے ساتھ

دینے والے نے اس انداز میں دستک دی ہے
گر پڑا ٹوٹ کے دروازہ بھی زنجیر کے ساتھ

دیکھ آ کر کبھی الماری میں رکھی خواہش
میری آنکھیں بھی پڑی ہیں تری تصویر کے ساتھ

سانس کی ڈور سے لپٹی ہے تمناؤں کی بیل
عمر وابستہ ہے اک خواب کی تعبیر کے ساتھ

لاتعلق نہ ہو مجھ سے کہ حقیقت یہ ہے
میری قسمت بھی جڑی ہے تری تقدیر کے ساتھ

مجھ کو امید بہت ہے کہ اثر ہوگا کچھ
اب کے خط میں مرے آنسو بھی ہیں تحریر کے ساتھ

اس طرح میں نے نبھایا ہے تعلق غم سے
جس طرح زخم کا رشتہ ہو کسی تیر کے ساتھ

اشرف کمال

غزل

اب بھی اس آنکھ کی تنویر پڑی ہے مجھ میں
اک محبت بھری تحریر پڑی ہے مجھ میں

جو کسی اور سے ملنے نہیں دیتی مجھ کو
تیری چاہت کی وہ زنجیر پڑی ہے مجھ میں

ہر طرف پھیلی مقدر کی سیاہی ہے مری
یا کوئی زلف گرہ گیر پڑی ہے مجھ میں

جو رگ و پے میں اترتا ہی چلا جاتا تھا
اب بھی اس لہجے کی تاثیر پڑی ہے مجھ میں

سوچتا ہوں اسے کیسے زمیں برد کروں
میری رسوائی کی تشہیر پڑی ہے مجھ میں

مجھ کو لگتا ہے کسی اور جہاں کا شوکت
وہ جو اک شخص کی تصویر پڑی ہے مجھ میں

افتخار شوکت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ لہر لہر تھا بے چین رُوح کے مانند
وجود اُس کا سمندر کا ظرف رکھتا تھا

غزل

وجہِ وجودِ عشق ہے وجہِ حیاتِ عشق
اصلِ درود عشق ہے اصلِ صلوٰۃ عشق

تن کا نصاب اور ہے من کا نصاب اور
تن کی زکوٰۃ صوم ہے من کی زکوٰۃ عشق

سر پر فلک ہے عشق کا نیچے زمینِ عشق
میں خود فضائے عشق ، مری کائنات عشق

میری فنا فنا نہیں وہ مرگ ہو کہ نیت
ہے دردِ دل میری بقا میرا ثبات عشق

دل میں سرورِ عشق ہے آنکھوں میں نورِ عشق
سر میں وفورِ عشق ہے میری حیات عشق

بحرِ رجز میں لکھوں کہ بحرِ خفیف میں
میری غزل وفا ہے مری حمد و نعت عشق

شورِ شعورِ ذات ہے وجہِ غرورِ ذات
میں آپ ذاتِ عشق ہوں اور میری ذات عشق

محمد سلیم ساگر

غزل

گُل شاخ پہ یوں کِھلا ہوا ہے
جیسے یہ دیا جلا ہوا ہے

وہموں میں تُو کیا پڑا ہوا ہے
ہو گا وہی جو لکھا ہوا ہے

موسیٰؑ کو ہے ذات پر بھروسہ
فرعون خدا بنا ہوا ہے

قطرہ ہے نمونہ سمندر
بندے میں خدا چھپا ہوا ہے

ذرّہ خورشید کا ہے مظہر
صحرا ، دریا مرا ہوا ہے

ہیں ارض و سما حجاب دونوں
حُسنِ فطرت چھپا ہوا ہے

گوشے گوشے میں درحقیقت
ایک ایک جہاں بسا ہوا ہے

جو کچھ پسِ پردہ ہو رہا ہے
دیوار پہ سب لکھا ہوا ہے

تصویر میں آپ ہی مصور
اک عکس نما بنا ہوا ہے

ہر پائے طلب کے چار جانب
فردوس کدہ بچھا ہوا ہے

ہونے لگے رند سر بسجدہ
رنگِ ساقی اُڑا ہوا ہے

محبوب ہے چشمِ کہکشاں کا
جو ذرّہ جہاں پڑا ہوا ہے

دل جھوم رہے ہیں پہلوؤں میں
یہ کون غزل سرا ہوا ہے

اللہ رے عظمتِ مدینہ
کونین کا سر جھکا ہوا ہے

فیضانؔ وہی عزیزِ حق ہے
جو اُس کے حبیب کا ہوا ہے

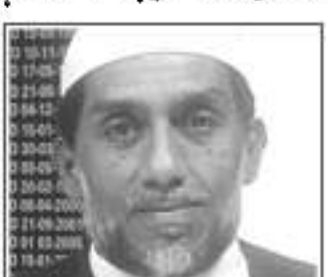

فیض رسول فیضان

غزل

مرے کچے گھروندے کھا گیا ہے
کہ دریا اس قدر بپھرا ہوا ہے

تماشا بے بسی کا دیکھنے کو
کوئی ٹیلے پہ چڑھ کر ناچتا ہے

مری چیخیں فلک کو چھو رہی ہیں
مرا حاکم مگر بہرہ ہوا ہے

علامت زندگی کی تھا جو پانی
وہی اب موت بنتا جا رہا ہے

کوئی تو روک لے سیلِ رواں کو
مرے بچے بہا کر لے گیا ہے

مجھے دکھ ہے بلوچستان کا بھی
مگر تونسہ کلیجہ کاٹتا ہے

اُسے ارشد کبھی رہبر نہ کہنا
جو لاشوں پر سیاست کر رہا ہے

ارشد محمود ارشد

غزلیں

اتنی آسانی سے ہاتھ آتی ہے کب کوئی غزل
رات، اور رات بھی بیدار ہو تب کوئی غزل

یہ بھی ممکن ہے سرِ شام افق پر ہو طلوع
یہ بھی ممکن ہے کہ ہو آخرِ شب کوئی غزل

جو بھی احباب ہیں اس دل کے قریں، سب موجود
وہ نہیں ہے کہ ہوئی جس کے سبب کوئی غزل

کوئی کہتا ہے کہ موقوف کرو اور سے
کوئی کہتا ہے نہیں آج ہی، اب کوئی غزل

ایک ہی شرط پہ آیا ہے روانی میں قلم
جس میں موجود ہو آداب، ادب کوئی غزل

عالمِ خواب، زبان اور قلم خشک ہوئے
میر و غالب نے کہا بیٹھ کے جب کوئی غزل

علی عارف

کیا فہرست مکمل کر لی کیا دریا برد ہوا
کتنا خواب سلامت ہے اور کتنا دریا برد ہوا

چرواہے کی خوش الحانی لے کے سر بھی ڈوب گئے
کانوں میں تھا سحر کسی آواز، کا دریا برد ہوا

اک مٹی کا ٹیلہ پانی میں ابھرا تو برق گری
میں موجوں کی زد میں تھا یا مجھ سا دریا برد ہوا

باتیں کرتے پتھر اس کے سانسیں لیتی دیواریں
اک ایسا بھی گھر تھا جیتا جاگتا دریا برد ہوا

جس گرداب میں چھلکا تھا امید کے ہاتھوں پیمانہ
اسی بھنور میں آخری ایک دلاسا دریا برد ہوا

ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو ساحل پر دیکھنے آئے ہیں
کون ہے جو ان لہروں میں بھی پیاسا دریا برد ہوا

جس جا دریا برد ہوئے تھے درہم اور دینار علی
اسی جگہ پر ایک فقیر کا، کاسہ دریا برد ہوا

غزل

عجب دن تھے، کہ پیاسوں پر غضب ڈھاتا تھا جب دریا
مجھے تو میرے گھر ملنے، چلا آتا ہے اب دریا

بتا کیسے بجھائیں گے بھلا یہ پیاس کھیتوں کی
کہ پیاسے ہو گئے ہیں خود مری دھرتی کے سب دریا

نکالے گا بھلا کب تک بھنور سے میری کشتی کو
کنارے تک، مری کشتی کو پہنچائے گا کب دریا

بپھرنے پر بہا لے جائے جو بھی راہ میں آئے
بگڑ جائے تو پھر پوچھے نہیں نام و نسب دریا

کبھی تو حق ہمسایہ بھی اس کو بھول جاتا ہے
مری بستی پہ چڑھ دوڑے، کبھی تو بے سبب دریا

ہڑپ کر جائے اک لمحے میں فرعونی خدائی کو
کسی کے دبدبے، میں رعب میں آتا ہے کب دریا

یقیں مانو، کسی کی بھی نہیں سنتا، نہیں سنتا
یقیں مانو، کہ اپنی آئی پہ آ جائے جب دریا

اکرم ناصر

غزل

فرح شاہد

دریا میں ڈال بیٹھے ہیں کشتی انا کے ساتھ
ڈوبیں گے ہم ضرور مگر ناخدا کے ساتھ

جینا پڑے گا آپ کو میری وفا کے ساتھ
اس نے پیام بھیجا ہے دیکھیں دعا کے ساتھ

سن کے صدا اداس نہ ہو جائے تو کہیں
لپٹی ہوئی اداسی ہے میری صدا کے ساتھ

جب بھی وہ مسکرائے تو اچھا لگے مجھے
مجھ کو قبول ہوگا وہ ہر اک ادا کے ساتھ

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

دکھوں کی زد میں تھی پتھر کی سل بھی
سو ڈھہہ کر بہہ گئی دیوار دل بھی

غزل

آگ ہے اندر مگر باہر دھواں کوئی نہیں
لوگ سمجھے ہیں یہاں آتش فشاں کوئی نہیں

جل رہے ہیں امتحاں زدگان ہم سے ، دیکھ کر
کام یابی اُن کی جن کا امتحاں کوئی نہیں

چل رہے ہیں رنگ و بو کے سلسلے کیسے اگر
جو بھی ہے ظاہر ہے اور کارِ نہاں کوئی نہیں

ہم زمیں زادوں کو تو بس چاند تارے چاہئیں
وہ بھی جب ہم کو میسر آسماں کوئی نہیں

حبس کے موسم میں ٹھہرے پانیوں سے لوگ ہیں
جب ہوا کوئی نہیں، آبِ رواں کوئی نہیں

ہم نے خود کاٹے ہیں اپنے پیڑ اپنے ہاتھ سے
اس پہ شکوہ بھی کہ سر پر سائباں کوئی نہیں

ہم ہیں نجدِ یاس میں بھٹکے ہوئے حرماں نصیب
بحر و بر میں اپنی منزل کا نشاں کوئی نہیں

خوابِ غفلت کے مریضوں اور سبک دوشوں کا دیس
گویا ان کے سامنے کارِ گراں کوئی نہیں

کچھ نہ کچھ تو رائیگانی کا ثمر بھی چاہیے
کیوں کہ اس عالم میں امرِ رائیگاں کوئی نہیں

دین بھی بکتا ہے، علم و عدل بھی ، دستار بھی
سارے گاؤں میں محبت کی دکاں کوئی نہیں

آؤ ہم ہی کھول لیں کوئی محبت کی دکاں
یہ وہ کاروبار ہے جس میں زیاں کوئی نہیں

فائدہ اِس کا اٹھا کر آج سونا چاہیے
آج قصہ گو کے ہاں بھی داستاں کوئی نہیں

علمدار حسین

غزل

عشق سائیں تُو جس قدر چمکا
میرے جذبوں کو مثلِ زر چمکا

بجھ گیا پل میں جبر کا سورج
جونہی نیزے پہ ایک سر چمکا

میری ہستی اسیرِ ظلمت تھی
تم جو آئے تو گھر کا گھر چمکا

کتنے لوگوں نے زندگی پائی
ایک چشمہ جو ریت پر چمکا

اِک مسافر کے گھر پلٹنے پر
بعد مدت کے رُوئے در چمکا

ماں کے قدموں میں بیٹھ کر پیارے
تُو مقدر کو عمر بھر چمکا

یہ جو سینے میں قید ہے ساحلؔ
اِس پرندے کے بال و پر چمکا

ارسلان ساحل

غزل

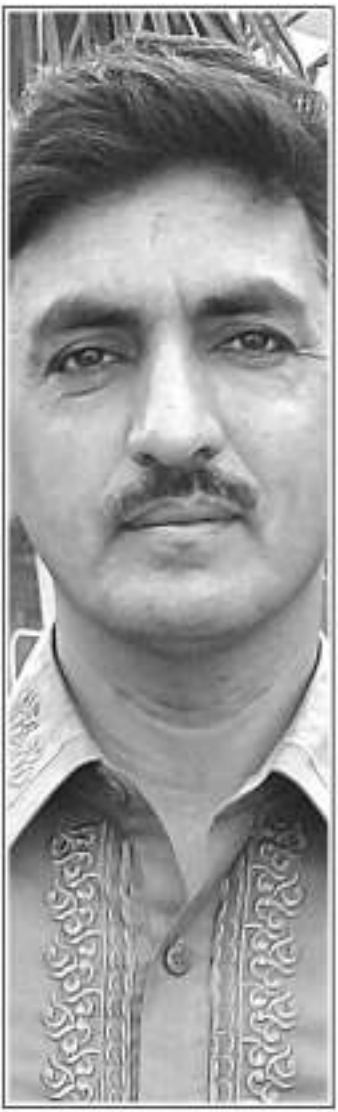

خوش خرامی میں جو حسرت کا مزا لیتے ہیں
تیرے الزام کی وحشت کا مزا لیتے ہیں

اب تو مصروف ہیں اِک نقش بنانے میں ہم
آبلہ پائی میں قسمت کا مزا لیتے ہیں

یُوں اُترتی ہیں مصائب کی بلائیں اِن پر
اہل سادات بھی نسبت کا مزا لیتے ہیں

چھوڑ یہ وصل تجھے بات بتاؤں دل کی
ہجر میں رہ کے بھی الفت کا مزا لیتے ہیں

بولنا جرم ہے ہم خاک نشینوں کا یہاں
حاکمِ وقت کی دہشت کا مزا لیتے ہیں

دن تو بازار کے کھاتے میں گذر جاتا ہے
رات کو لیٹ کے فرصت کا مزا لیتے ہیں

دُنیاداری کا یہ جھنجھٹ تو رہے گا بابر
باغ کے کونے میں خلوت کا مزا لیتے ہیں

امجد بابر

غزلیں

ہجومِ بوالہوس کی خیر خواہی سے پرے رہنا
کٹھن راہوں میں رہنا کم نگاہی سے پرے رہنا

حریفوں سے سرِ مو بھی کوئی خطرہ نہیں لیکن
عدالت میں حلیفوں کی گواہی سے پرے رہنا

قناعت شیوۂ پیغمرانہ ہے زمانے میں
کسی اقلیمِ بے پایاں کی شاہی سے پرے رہنا

کہیں زہرہ جبینوں کے تصنع میں نہ لٹ جائے
جوانی قیمتی شے ہے تباہی سے پرے رہنا

زمانے بھر کی راحت ہے مگر خلوت نشینی میں
زمانے کی ہمیشہ جلوہ گاہی سے پرے رہنا

ترے لشکر کے جس نے بھید کھولے ہیں لڑائی میں
اسد عہدِ وغا میں اُس سپاہی سے پرے رہنا

اسد اعوان

چمن میں بالمشافہ غالیہ مُو سے شکایت کی
کہ میں نے چشمِ تر سے چشمِ مہ رُو سے شکایت کی

یہ تیری کج روی کب تک رہے گی میری آنکھوں سے
کُھلے دل سے سرِ محفل تنک خُو سے شکایت کی

نگاہِ غیض سے سب دیکھتے تو ہیں مجھے لیکن
کہاں پر ساکنانِ کوچہ و کُو سے شکایت کی

اسد عہدِ جوانی میں یہ رسوائی نہ کھا جائے
اِسی رسوائی پہ اسلوبِ مہ رُو سے شکایت کی

غزلیں

یہ سچ ہے کہ رہ میں زمانہ پڑے گا
مگر تم سے ملنے تو آنا پڑے گا

یقیں گر نہیں ہے وفا پر ہماری
تمھیں پھر ہمیں آزمانا پڑے گا

بجا ہیں یہ سامانِ ہستی پہ پھر بھی
انھیں چھوڑ کر جلد جانا پڑے گا

پریشاں رُتوں کے تغیر کی خاطر
تمھیں بس ذرا مسکرانا پڑے گا

زمیں بیضوی ہے تو یوں چلتے چلتے
کہیں راہ میں آشیانہ پڑے گا

تمھیں دل لگانے سے فُرصت ملی تو
ہمیں سے تمھیں دل لگانا پڑے گا

یونہی ٹھوکروں پر لگیں ٹھوکریں تو
کہیں نہ کہیں لڑکھڑانا پڑے گا

راجہ عبدالقیوم

کچھ کرو دل فگار ہے یارو
آنکھ پھر اشک بار ہے یارو

سینکڑوں بار اُس نے پوچھا تھا
کیا ہمیں اُس سے پیار ہے یارو؟

سادگی تھی کہ ہم سمجھتے رہے
کچھ بھی ہو اپنا یار ہے یارو

پھول جب جھڑ گئے تو دیکھا ہے
زندگی خار خار ہے یارو

اُس نے آنا تھا اور نہ آنا ہے
پھر بھی کیوں انتظار ہے یارو

دامنِ دل کی کیا ہو بخیہ گری
یہ تو اب تار تار ہے یارو

ہم سمجھتے تھے کیسے ٹوٹے گا
عُمر کا اعتبار ہے یارو

کارواں کب کا جا چکا لیکن
اب بھی رہ میں غبار ہے یارو

اعتبارِ خزاں نہیں ، یہ دل
آشنائے بہار ہے یارو

غزل

ابھی کچھ جیت باقی ہے ابھی کچھ مات باقی ہے
مجھے قسمت نے جو بخشی ہے وہ سوغات باقی ہے

کوئی تہمت نہیں جس پر یہاں وہ آدمی کب ہے
تو میں بھی ابن آدم ہوں مری کب ذات باقی ہے

چلو باتیں کریں ہم تم جو ہوں بھرپور جیون سے
سمجھ لیں زندگی کی آخری یہ رات باقی ہے

ہوئیں لاکھوں مگر اب تک نہ ہو پائی جو ہونی تھی
ہمارے درمیاں ہونی تھی جو وہ بات باقی ہے

مرا دشمن مجھے پھر کہہ رہا ہے جان جاں ناصر!
نجانے کون سی اب میرے گھر میں گھات باقی ہے

عامر عباس ناصر اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بکھری پڑی ہیں چار طرف سبز پتیاں
خالد ملا نہ سایۂ اشجار دوستی

غزل

پردیسی ہیں لیکن اپنی آب و گل لاہور میں ہے
نگری نگری چھان چکے ہیں پر منزل لاہور میں ہے

صحرا جنگل پربت گھومے قریہ قریہ پھول چُنے
لیکن سچ پوچھو تو صاحب نخلِ دِل لاہور میں ہے

ناصر جالب ساغر دانش فیض و امجد سے استاد
اردو کا ہر گہرا ساگر اور ساحل لاہور میں ہے

داتا کے دربار کا میلہ، میلہ مادھو لعل حُسین
گلیوں میں ہر شام چراغاں اور جھلمل لاہور میں ہے

پھجّا فیقا، نیفا، ماما، اور گوگے کے بونگ چنے
گورے آ کر جھوم رہے ہیں اتنا چل لاہور میں ہے

دو فٹ چوڑی گلیوں میں اخلاص سے پہیہ چلتا ہے
پیار سے رشتے بُننے والی واحد مل لاہور میں ہے

ہجرت کرنے والے بھی دیہات سے کہہ کر آتے ہیں
اپنی روزی روٹی اپنا مستقبل لاہور میں ہے

عاطف جاوید عاطف

غزل

کچھ زیادہ ہی سوچتی ہوں کیا
اک پہیلی سی بن چکی ہوں کیا

تیرے لہجے میں اِک کدورت تھی
خود سے بھی بدگماں ہوئی ہوں کیا

چوٹ لگنے پہ درد لازم ہے
کسی پتھر سے میں بنی ہوں کیا

ساتھ تیرے بہت اذیت تھی
جانتی تو ہوں مانتی ہوں کیا

گھر سے تو تم نے کر دیا رخصت
سوچ سے بھی جدا ہوئی ہوں کیا

آنکھ میں اشک کیوں نہیں آتے
غم سے دامن چھڑا چکی ہوں کیا

تم مجھے یاد کیوں نہیں آتے
میں تمہیں بھولنے لگی ہوں کیا

سانس آتی ہے سانس جاتی ہے
زندگی تجھ کو جی رہی ہوں کیا

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نفرت کو اُن آنکھوں سے چھلکنا نہیں آتا
ہم لوگ بھی ماتھے پہ بَل آنے نہیں دیتے

غزل

بہار آئی کسی شاخ پر نہ آئے پھول
مگر وہ آیا تو مل کر جو مسکرائے پھول

خدا تمھاری سبھی خواہشات جانتا ہے
تمھیں بنانا تھا اس واسطے بنائے پھول

تو آ کے دیکھ لے کتنے حسین لگتے ہیں
جو تیرے نام پہ گلدان میں سجائے پھول

بس ایک نام پہ ہی آ کے تان ٹوٹتی ہے
جو ہے ہی پھول اسے کیا کہیں سوائے پھول

تو کر رہا ہے تو اس پر غرور بنتا ہے
کھڑے ہیں پھول ترے واسطے اٹھائے پھول

نہ سیم و زر کی تمنا رہی، نہ شہرت کی
صغیر ہم نے ہمیشہ فقط کمائے پھول

صغیر احمد صغیر

غزل

بے یقینی کی فضاؤں میں ہیں
ہم گھرے فرشی خداؤں میں ہیں

حبسِ بے جا میں ہیں گاؤں میرے
شہر کے شہر گھٹاؤں میں ہیں

رونقِ صحِ بہاراں تھے کبھی
ہاں وہی پھول خزاؤں میں ہیں

ہر طرف موت کے ہیں ہرکارے
کانپتے ہاتھ دعاؤں میں ہیں

اب کسی طفل تسلّی کا کیا
گھل چکے زہر ہواؤں میں ہیں

داغ دامن پہ نہیں ہے کوئی
ہاں بہت چھید قباؤں میں ہیں

ہم سے محتاط بھی مر مٹتے ہیں
رمز ایسے بھی اداؤں میں ہیں

بے ثمر کٹ رہے ہیں دن احمدؔ
کتنے بے فیض خداؤں میں ہیں

احمد محسود

غزل

ہنسنے والا ہوں نہ رونے والا
میرا کچھ بھی نہیں ہونے والا

ڈھلتے سورج کی طرح لگتا ہے
ہاتھ رنگوں میں ڈبونے والا

نرم گفتار بھی ہو سکتا ہے
تیغ میں پھول پرونے والا

آسمانوں میں قدم ہیں تیرے
میں ہوں مٹی کے بچھونے والا

خواب میں بھی تجھے چھُو سکتا ہے
جاگتے جاگتے سونے والا

دیر سے دیکھ رہا ہے تجھ کو
اک دیا آخری کونے والا

سرفراز تبسم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ تو کہہ ، کیا ہوا ، اے ہوائے اَلم
دُور تک تار سا بادباں بھی نہیں

غزل

ہزار بار کہوں اس کے پاس جاؤں نہیں
مگر میں خود کو کبھی اس سے روک پاؤں نہیں

یہ زندگی تو کڑی دھوپ کا سفر ہی رہی
اور اس سے اگلے سفر میں بھی دکھتی چھاؤں نہیں

مرے قریب کے سب لوگ سادہ دل ہیں جناب
جہاں پہ آپ لٹے ہیں وہ میرا گاؤں نہیں

کڑکتی دھوپ میں جو سایہ بن کے ساتھ چلے
میں اپنے آپ کو بھولوں انہیں بھلاؤں نہیں

جو ذوق رکھتے نہیں شاعری کا اے کیفی
غزل تو کیا انہیں اک شعر تک سناؤں نہیں

کیفی قلندر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہل زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہر جاناں سے کوئی تازہ نوا آنے کو ہے

غزلیں

کم ہی کسی میں ہمدردی ہے
بیدردی سی بیدردی ہے

کام نہیں مصروف ہوں پھر بھی
کیا بے کار کی سر دردی ہے

اپنا ٹھکانہ کیا ہونا ہے
ہر پھر آوارہ گردی ہے

کیا دشت ہے خواب سراب لیے
آنکھوں میں ریت سی بھر دی ہے

سرخی سی جمی ہے آنکھوں میں
چہرے پر پھیلی زردی ہے

امر مہکی

دل شکستہ ہے آنکھ پُھوٹی ہے
کس جگہ آ کے آس لُوٹی ہے

بھاگتا رہ گیا سٹیشن پر
آخری گاڑی مجھ سے چُھوٹی ہے

اِک اُچٹتی نظر نے لمحے میں
چین چِھینا ہے نیند لُوٹی ہے

سانس بھی کھل کے کب لیا میں نے
زندگی بے سبب ہی روٹھی ہے

آنکھ کو آنکھ جانتی ہے امر
کون سچّی ہے کون جھوٹی ہے

غزل

ایک تصویر مرے دل میں پڑی رہتی ہے
اور دیوار میں بس کیل گڑی رہتی ہے

وہ بھلے آئے نہ آئے مرے گھر کی جانب
آنکھ پھیلائے ہوئے بازو کھڑی رہتی ہے

میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں خود سے ملنے
زندگی صحن میں بے کار پڑی رہتی ہے

دل کا صحرا ہے کہ قطرے کو ترس جاتا ہے
آنکھ کے خطے میں ہر روز جھڑی رہتی ہے

کوئی مرتا ہے مرے تیری بلا سے اے دل
تجھ کو ہر وقت بس اپنی ہی پڑی رہتی ہے

گو مرے پاس نہیں وقت مرے اپنے لیے
پر مرے بازو پہ ہر وقت گھڑی رہتی ہے

وہ کھڑی رہتی ہے تصویر میں پائل باندھے
اور مرے کمرے میں جھنکار پڑی رہتی ہے

تم جہاں پر ہو وہاں سے نہیں لوٹا کوئی
پر ترے آنے کی امید بڑی رہتی ہے

اب تو صیاد مرے مجھ کو رہائی دے دے
اب تو زنجیر کی بس ایک کڑی رہتی ہے

سانحہ کوئی تو اے دوست مرے ہونے کو ہے
آج کل زیست پریشان بڑی رہتی ہے

علی رضا بلوچ

غزل

خواب اک حقیقت کو دیکھنے پہ مائل تھا
آنکھ بھر سمندر میں میرا عکس شامل تھا

گھونسلے نہیں چھوڑے جس نے میری شاخوں پر
کون ایسا وحشی تھا، کون ایسا قاتل تھا

جس نے مجھ کو دریا میں ڈوبتے ہوئے دیکھا
کیا کہوں زمانے سے، موج تھی کہ ساحل تھا

مسئلہ کوئی تو ہے جس نے اُس کو روکا ہے
ورنہ ساتھ چلنے پر دوستو وہ مائل تھا

راستے میں چھوڑا ہے احمؔد اُس ستم گر نے
وہ ہی میرا رستہ تھا، وہ ہی میری منزل تھا

عتیق احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آسمان پر شفق کی لالی ہو
جَل اُٹھیں شہر کے کنارے بھی

غزل

کون کس شے کا ہے حق دار، خُدا جانتا ہے
مت کرو بحث مرے یار، خُدا جانتا ہے

دعویٰ کرنے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی
کون کِس کا ہے پرستار، خُدا جانتا ہے

کون ہے حق کی طرف، کون ہے باطل کی طرف؟
کون ہے کِس کا طرف دار، خُدا جانتا ہے

میں اُصولاً تو ہوں پُر امن ہی رہنے والا
کیوں اُٹھانا پڑی تلوار، خُدا جانتا ہے

کچھ بھی کہنا نہیں اب اپنی صفائی میں مجھے
کون کِتنا ہے گُنہ گار، خُدا جانتا ہے

لوگوں کا کام ہے الزام لگانا کیفی!
فِکر مت کر، ترا کِردار خُدا جانتا ہے

محمود کیفی

غزل

جتنے غم تھے آدمی تک آ گئے
کیسے سائے زندگی تک آ گئے

دوستی کتنی نمایاں ہو گئی
آپ بھی جب دشمنی تک آ گئے

عشق کی کلفت وہی ہے آج بھی
مرحلے تیری خوشی تک آ گئے

حاسدوں نے کس کو بخشا ہے کبھی
ہاتھ ان کے ہر کسی تک آ گئے

اوڑھ کر پھر پارسائی کی ردا
راہزن ہی رہبری تک آ گئے

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

غزل

مرے چمن کے سبھی گُل اجاڑ ڈالے گی
کوئی تو آ کے بدل ڈالے اِس خزاں کا رخ

خدائے لوح و قلم کے سوا تو کوئی نہیں
مرے یقین کا مرکز، مرے گماں کا رخ

نہ جانے کون سے کردار درمیان میں ہیں
نہ جانے کون سی جانب ہے داستاں کا رخ

سبھی چراغ یہاں کے بجھے بجھے سے ہیں
ستارے کاش کریں میرے خاکداں کا رخ

ہمیں لگیں گے ترے طعن کے سبھی نشتر
ہماری سمت مڑے گا ترے بیاں کا رخ

جیاؔ کے دل نے کیا جادۂ وفا کا قصد
کیا ہے طائرِ زخمی نے آسماں کا رُخ

جیا قریشی

غزل

سنا ہے تجھ کو ڈالر مل رہے ہیں
ترے ایواں مگر کیوں ہل رہے ہیں

جو حق کہتے ہیں حق ہی بولتے ہی
گلے ان کے تواتر سل رہے ہیں

زمیں پہ آگ پھیلی نفرتوں کی
فضا میں تیرتے کچھ دل رہے ہیں

ہے منظر ریگزاروں کا وہاں پر
جہاں صدیوں سے آب و گل رہے ہیں

فلک پہ ہو گیا تاریک سورج
مری دھرتی پہ سورج کھل رہے ہیں

نہ ہے زخار دفنانے کو مٹی
جہاں پانی سے لاشے مل رہے ہیں

ریحانہ شبیر زخار

غزل

اک ستارہ مدار سے نکلا
دل مرے اختیار سے نکلا

تیری یادوں کے غار سے نکلا
قریۂ تنگ و تار سے نکلا

زرد سے سبز ہوتا جاتا ہے
اک شجر انتظار سے نکلا

رات آیا ترا خیال مجھے
پھر مرا دل قرار سے نکلا

منظرِ عام سے ہٹا تھا دور
سو میں سب کے شمار سے نکلا

موت کچھ بھی نہیں ہے اس کے لیے
جو سمے کے حصار سے نکلا

مہر علی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھل پڑیں یا نہ پڑیں، پیڑ جڑیں چھوڑیں گے
پا بہ گل مجھ میں بھی اک چاہنے والا تھا مرا

غزل

اتنی مدت کے بعد آئے ہیں
آپ کو دیکھ لیں تو چلتے ہیں

جب بھی اک یاد کی ہوا آئے
دشتِ ہجراں میں پھول مہکے ہیں

شکر کر تجھ پہ ہو گئے ہیں عیاں
ہم کہاں ہر کسی پہ کھلتے ہیں

خود کو دیکھا تو مجھ کو یاد آیا
پھول اکثر زمیں پہ ڈلتے ہیں

خواب دیکھے ہیں اس کی آنکھوں سے
اور خوابوں سے ہم نکلتے ہیں

تیری خوشبو سے دل کے آنگن میں
خار گلزار ہونے لگتے ہیں

گر محبت سے دیکھ لیں ہم کو
روح کے سارے زخم سلتے ہیں

رشک کرتے ہیں آسماں والے
ہم زمیں زاد ایسے ملتے ہیں

جسم در جسم پیار ہوتا ہے
روح در روح معنی کھلتے ہیں

ساری دنیا سے ہو کے دور سمن
آؤ ہم خواب ہی میں ملتے ہیں

رخسانہ سمن

غزلیں

کیا کہوں کتنا ہُوا عشق میں نقصان مرا
ہر نفس قتل ہُوا سینے میں ارمان مرا

یُوں ترے جانے پہ محسوس ہُوا ہے کہ کہیں
کھو گیا جیسے بہت قیمتی سامان مرا

خاک اُڑتی ہے بگولوں کی طرح آج یہاں
تھا اِسی دشت میں آباد گُلستان مرا

میں ترے ہاتھ پہ اُبھرا ہُوا اِک حرفِ غلط
تیری مرضی تُو بنا دے کوئی عُنوان مرا

سال بھر اُس کی مشقت کا صلہ نانِ جَویں
سوچتا رہتا ہے ہر وقت یہ دہقان مرا

میں نے قائل اُسے دھڑکن میں بسائے رکھا
وہ کہاں ماننے والا تھا یہ احسان مرا

عمر قیاز قائل

میں بُھول کر بھی اُسے اَب صدا نہیں دیتا
کہ جان کر کوئی خُود کو سزا نہیں دیتا

بُھلا دیا ہے مجھے اُس نے ایک مُدت سے
بس ایک میں ہُوں کہ اُس کو بُھلا نہیں دیتا

فدائے حُسن سہی میں مگر خیال رہے
بشر کے پاؤں پہ سر کو جُھکا نہیں دیتا

بس اِک قدم کی ہے دُوری پہ منزلِ ہستی
مگر وہ شخص مجھے راستا نہیں دیتا

نہ جانے پیشِ نظر اُس کو مصلحت کیا ہے
کہ ایک عہدِ وفا بھی نِبھا نہیں دیتا

جفائیں سہہ کے بھی چُپ چاپ چل دیا قائل
ہر اِک کو ظرف یہ میرا خُدا نہیں دیتا

غزل

وہ ہر سانس الفت کا دم بھرنے والا
کہ تاریکیوں میں ہے یکسر اُجالا

جہاں میں جسے تھا پنپنا سکھایا
مری ذات پر اُس نے کیچڑ اُچھالا

وہی پھر سے اُمیدِ فردا دلا کر
ہے چھینا گیا میرے منہ کا نوالہ

سخن میرا کانوں میں رس گھولتا ہے
محبت کو میں نے ہی شعروں میں ڈھالا

یہ کالم ، مضامیں ، ہیں پہچان میری
کتابیں ، رسالے ہیں میرا حوالہ

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اِسی تنگ و تار اُطاق میں، اِسی کُنج کے کسی طاق میں
غمِ یار رکھ کے گیا تھا میں، غمِ روزگار یہیں کہیں

غزل

کچھ بھی ظاہر نہیں ہے چہرے سے
لوگ کھلتے ہیں ساتھ رہنے سے

شعر کہنے کو کہہ تو سکتا ہوں
شعر ہوتا نہیں ہے کہنے سے

میں بھی آنگن سے ہی پلٹ آیا
وہ بھی نکلی نہیں تھی کمرے سے

منزلوں کا غرور کیا ہو گا
لوٹ جاؤں اگر میں رستے سے

یار مرنے کا فائدہ ہی نہیں
کچھ بدلتا نہیں ہے مرنے سے

کہہ دیا ہے کہ عشق ہو گیا تھا
جھوٹ بولا نہیں ہے بچے سے

اُس نے آنے میں دیر کی تو کُھلا
میں ہی پہنچا ہُوا تھا پہلے سے

بے حجابی تو بے حجابی ہے
حُسن چھلکا پڑے ہے پردے سے

امتیاز انجم

غزل

یہ سچ ہے بتانا بھی ممکن نہیں ہے
تمہیں بھول جانا بھی ممکن نہیں ہے

رہِ عشق میں یہ گڑی ہیں نگاہیں
ترا لوٹ آنا بھی ممکن نہیں ہے

یہیں جان واری تھی راہِ وفا میں
اسے اب نبھانا بھی ممکن نہیں ہے

ستایا بہت گل کو تم نے مری جاں
مگر اب ستانا بھی ممکن نہیں ہے

گل گلشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تیرگیاں پلٹ گئیں ، روشنیاں سمٹ گئیں
روپ کی دھوپ میں کھلے ، رات کے رنگ ڈھنگ بھی

ہم کہ ٹھہرے اجنبی.....

اپنی 88 ماڈل ایف ایکس کار کی فروخت کے لیے میں نے ایک دن پہلے اشتہار دیا تھا۔ آج اتوار کا روز تھا۔ چھٹی تھی چنانچہ صبح صبح میں نے گاڑی کو نہلا دھلا کر گیراج میں کھڑا کر دیا اور کسی مناسب خریدار کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی پر نظر پڑی تو میری طبیعت اداس ہوگئی۔ گاڑی کے ساتھ ایک طویل رفاقت ختم ہونے کو تھی۔

اگرچہ یہ کار میرے لیے کسی آرام وسکون اور سُکھ کا باعث کبھی بھی نہیں رہی بلکہ دورانِ سفر اکثر و بیشتر یہ بھاگ بھری کوئی نہ کوئی پریشانی ہی کھڑی کرتی رہی۔ چلتے چلتے سرِ راہ رُک کر تماشا کھڑا کر دینا اس کی عام روٹین تھی۔ اس کا چلن ہمیشہ سے کسی اڑیل اور ضدی گھوڑے سا رہا جو اپنے سوار کی منشا کے خلاف بیچ چوراہے میں کھڑا ہو جائے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دے۔ لیکن پھر بھی اس موقع پر ایک عرصہ قربت نے اک عجیب سی جذباتی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

کار برائے فروخت کا اشتہار دیتے وقت میرا خیال تھا کہ میں اسے کسی دوست نُما دائمی دشمن کے ہاتھوں بیچوں گا تا کہ ''دوستی'' کا صحیح حق ادا کرتے ہوئے خاموش انتقام لیا جائے۔ خود میرے ساتھ بھی ایک دوست نے ہی یہ مہربانی، فرمائی تھی۔ لیکن اس میں مسئلہ یہ تھا میرے تمام احباب اس کار کے احوال سے واقف تھے اور کئی ایک جنھیں میرے ساتھ کبھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا وہ تو باقاعدہ اس کے متاثرین میں بھی شامل تھے۔ بطور سواری یہ کار کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں تھی۔ اس کا کچھ بھی اوریجنل نہیں تھا۔ اس کے مالک سمیت اس کی ہر شے کئی کئی دفعہ تبدیل ہو چکی تھی۔ کئی کار میکینک تو اب باقاعدہ ''جواب'' دے چکے تھے کہ یہ ''مریض'' ٹھیک ہونے کا نہیں۔ شہر کے سارے میکینکس میرے واقف تھے۔ میرے موبائل میں اگر سب سے زیادہ نمبر موٹر میکینکس کے تھے تو اس کا سبب یہی کار تھی

ناصر محمود ملک

اور میں خود بھی اگر اب ایک اچھا میکینک بن چکا ہوں تو یہ بھی اسی کی عنایت ہے۔ چار پانچ کلو میٹر سے زیادہ سفر اس کے لیے Long Drive کے زُمرے میں آتا تھا۔ اور ایسا سفر اس کی طبع نازک پر ہمیشہ گراں گزرتا۔ شہر بھر کی کوئی سڑک ایسی نہیں جہاں 'موصوفہ' نے ہم سے دھکے نہ لگوائے ہوں اسی لیے میں سے "فیملی کار" کہتا تھا کہ کسی اکیلے آدمی کا اسے رکھنا اور استعمال کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے کسی دن ہم غلطی سے واش کر دیتے تو کئی روز تک اس کی طبیعت ناساز رہتی۔ 'سروس سٹیشن پر' لے جاتا تو وہ اسے واش یا سروس کرنے سے انکار کر دیتے۔ میرے اصرار پر کہتے کہ پہلے لکھ کر دیں کہ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ اس کرم بھری گاڑی میں کبھی ہارن لگوانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی! الحمد للہ! اس کا ہر پُرزہ بذاتِ خود ہارن کا کام دیتا تھا۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ڈرائیور سمیت اس کار کی ہر چیز چیخیں مارتی تھی۔ چلتی تھی تو سڑک پر گویا ایک طوفان سا بپا ہو جاتا تھا۔ کئی دفعہ ہم نے اسے ٹھیک کروانے کی بڑی مخلص سعی کی..... ایک دو دفعہ تو اس کی مکمل "Renovation" بھی کر کے دیکھی..... اب خوب سجانے سنوارنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ جو فیض نے کہا تھا کہ:

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

.....

کے مصداق اس کار کی ویرانی اور ہماری پریشانی کا کبھی علاج نہ ہو سکا۔ مختصر یہ کہ ایسی 'پراگندہ طبع' کار کہیں دیکھی نہ سُنی۔

لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ یہ کار بالکل ہی بے کار تھی۔ ہم اس سے کئی فائدے لے رہے تھے۔ روڈ پر چلنے اور سفری معاملات کو اگر ایک طرف رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہمیں کئی سہولتیں فراہم کر رہی تھی۔ مثلاً یہ ہماری پالتو وغیر پالتو بلیوں کے لیے ایک مستقل اور محفوظ مسکن کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ وہ اس میں آرام کرتی تھیں۔ بلکہ محلے کی کچھ دیگر بلیاں اپنی کوئی چھوٹی موٹی 'تقریب' وغیرہ بھی اسی میں منعقد کر لیتی تھیں۔ مزید برآں گھر میں اگر مہمان زیادہ آجاتے تو بچوں کو احتیاطاً اسی میں سُلا دیا جاتا اور یہ صرف بچوں پر ہی کیا موقوف تھا کئی

دفعہ خود میرے لیے بھی یہی جائے پناہ بنتی۔ اس کے علاوہ بچوں کے مختلف کھیلوں از قسم 'چھپن چھپائی' میں یہ بچوں کے لیے Hiding Place کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی۔ سو! کہا جاسکتا ہے کہ یہ کار اپنا کام چھوڑ کر باقی کئی کام بخوبی انجام دے رہی تھی۔ یوں اس کی مثال وطنِ عزیز کے بعض اداروں سے دی جاسکتی ہے جو اپنا کام کرنے کے علاوہ باقی سب کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اوپر بیان کردہ فوائد کے علاوہ کچھ ذیلی فائدے بھی تھے جو یہ گاڑی ''ہائی ڈیفالٹ'' ہمیں دے رہی تھی مثلاً دوست احباب رشتے دار وغیرہ نے کبھی یہ گاڑی مانگی نہیں تھی۔ ایک آدھ بار کسی نے مانگی تو ہاتھ باندھ کر واپس کر گئے بعد میں پتہ چلا کہ ان کے اپنے گھر میں لڑائی پڑ گئی تھی۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ نظر آیا کہ اسے کسی چور نے چرانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں نے جہاں چاہا اسے پارک کر دیا بلکہ کئی دفعہ جان بوجھ کر انتقاماً ایسی جگہوں پر پارک کیا جو کار چوری کے حوالے سے بدنام تھیں لیکن یہ ہمیشہ محفوظ اور ہم غیر محفوظ رہے۔

سو! یوں ان حالات کے پیشِ نظر اس کار کو بیچنے کا مکمل ارادہ کیا گیا۔ اور اخبار میں اشتہار دے کر اب ہم خریدار کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ طویل رفاقت کے ختم ہونے کے علاوہ پریشانی کا سبب یہ بھی تھا کہ جس طرح میں نے اس کا خیال رکھا تھا وہ شاید کوئی اور نہ رکھ سکے اور بقول غالب یہ غم بھی تھا کہ:

''کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد'' ..... فروخت کا سوچتے وقت میری ترجیح زیادہ قیمت وصول کرنا قطعاً نہیں تھا (اور یہ خواہش ہو بھی کیسے سکتی تھی) لیکن یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسا خریدار آئے جو اس کا قدردان بھی ہو۔ اور پر ایک ایسا مطلوب بندہ مل ہی گیا۔ دراصل سلیم الفطرت اور ضعیف الدماغ انسانوں کی کسی دور میں بھی کمی نہیں رہی اور ایسے سودوں کے لیے 'سودائی' آپ کو مل ہی جاتے ہیں۔ بھاؤ تاؤ کے بغیر اس نے جو دیا میں نے وصول کر لیا اور چابی اس کے حوالے کر دی۔ وہ صاحب گاڑی لے کر چلتے بنے۔ جاتی گاڑی پر ایک نظر ڈال کر میں پیچھے پلٹا تو دیکھا کہ پالتو بلیاں گیراج میں پریشان گھوم رہی تھیں۔ شاید اُن کے آرام کا وقت ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

دوسرا خط [کہانی]

تھوڑے دنوں بعد پھر نیلا لفافہ آ گیا۔ اِس بار اُسے کھولتے میرا دل ڈوبے میں نے اپنی چھٹی حِس کو سر جھٹک کے ڈانٹا۔ خط کھولتے لیکن ہاتھ لرزے۔

وہی بات ہوئی۔

اُس کا لفظ لفظ رو رہا تھا۔

لکھا تھا۔

مارے آپ نہیں گئے۔

میں ہی مری ہوں۔

خودکشی کی لذت سے گزرے بغیر ہی۔

میری لاش سے مل لیجئے۔

آج

اُسی جگہ

اُسی ریستورانت کے باہر

پارکنگ ایریا میں

لاش سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی۔

اپنی گاڑی میں ہی ہوں گی۔

اگر تب تک دفن نہ ہوئی۔

پڑھ کے طوطے اڑ گئے۔

یہ اِسے کیا ہوا؟

کیا سنسنی پھیلا رہی۔

اِس بار وہ پہلے سے آئی ہوئی تھی۔

تھی بیٹھی اپنی گاڑی میں۔

میں نے اُس کی گاڑی کے ساتھ اپنی گاڑی کھڑی کر دی۔

دونوں کے ایک دوسرے کی طرف کے شیشے ایک ساتھ نیچے سِر کے۔

میں نے مسکرا کے سلام کیا۔

اُس نے ٹکٹکی لگا کے عجیب سی اداس نظروں میں اپنی ہیرے جیسی آنکھوں کی جگمگ بجھا کے، گم ہوئے دیپ جلا کے مجھے دیکھا اور دیکھتی رہی۔

میں نے اشارے سے اُسے پوچھا۔

ریستورانت میں چلیں؟

اُس نے ''ڈیش بورڈ'' سے ''فیس ماسک'' اٹھا کے دِکھاتے ہوئے کہا۔

آج یہ بھی بند ہے، ''کرونا'' کی وجہ سے۔

میں گاڑی سے اتر کے اُس کے پاس جا کھڑا ہوا، پوچھا کوئی اور کھلا ہے، ریستورانت؟

بولی یہ فائیو سٹار بند ہے تو اور کون سا کھلا ہوگا۔

پھر؟ میں دھیرے سے بولا۔

ابدال بیلا

بولی، میری گاڑی میں آئیں گے یا میں آپ کی گاڑی میں بیٹھوں؟
تم آجاؤ، میں اپنی گاڑی کا دروازہ اُس کے لیے کھولتے بولا،
وہ سٹیرنگ پہ بازو پھیلا کے کسمسا کے بولی،
''آپ اتر آئے ہیں تو آجائیں میرے ساتھ''
چلو، تمہاری گاڑی ہے بھی زیادہ سوہنی۔
میں اپنی گاڑی کے دروازے بند کر کے ریموٹ بٹن سے اُسے لاک کر کے اُس کے ساتھ آ بیٹھا۔ اُس کی گاڑی کا رنگ ''نیوی بلیو'' تھا اور وہ خود بھی نیلی جیکٹ کے نیچے آسمانی جین پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔
تمہیں نیلا رنگ پسند ہے؟
بہت۔
تبھی تم نیلم پری بنی رہتی ہو۔
پری کی پَر جل گئے، وہ ایسے اداسی سے ہونٹ ہونٹوں سے کچل کے بولی، جیسے کوئی تازہ نکلتی کلی کو مسل کے ہونٹوں میں چبا رہی ہو۔
ہوا کیا پری؟
آپ کو بہت فون کیے، سب ''نو رپلائی''۔
پری، فون بند رکھتا ہوں، آج کل۔
کیوں؟
جواب لمبا ہے۔ میں اُسے ہنسانا چاہتا تھا، مگر اُس کی ہیرے کی کنی سی آنکھیں، جیسے اپنے ہی ہیرے سے کٹی کٹی ہوں۔
میں اُس کے ساتھ بیٹھ کے سیٹ اپنے حساب سے کچھ پیچھے کر کے ایڈجسٹ کرنے لگا۔
پری نے اپنی آٹومیٹک گاڑی پہ گیئر کا ہینڈل ہاتھ میں لے کر ''آر'' پہ رکھا۔
گاڑی دھیرے دھیرے پیچھے کو ہلی، رکی
اُس کی گاڑی میں ٹوں ٹوں ہو رہی تھی۔
پری نے گیئر کا ہینڈل ہلا کے ''ڈی'' پہ کیا۔
دھیرے سے مجھے بولی۔
سیٹ بیلٹ باندھ لیجئے۔ بہت دور جانا ہے۔
میں نے سیٹ بیلٹ باندھی،
ٹوں ٹوں بند ہو گئی۔
کدھر لے جا رہی پری؟
پری نے ایک دو لمحے رکی گاڑی میں مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھا۔ روشن براق بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں کی لمبی پلکوں کی جھالر کپکپائی۔ اُس نے آنکھوں کو تیز تیز پھڑپھڑایا، ایک آنسو اُس کی بائیں آنکھ سے سرک کے گال پہ آ گیا۔
اُس نے اپنا پتلا سا ناک بائیں کونے سے اوپر کھینچا۔
آنسو سرک کے اُس کے گلاب ہونٹوں پہ ایسے آ رکا، جیسے صبح دم گلاب پتی پہ شبنم اتری ہو۔
میں نے ہاتھ بڑھا کے اُس کے ہونٹوں کے بائیں کونے سے وہ آنسو اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی پہ لیا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے، پری نے ''ایکسیلیٹر'' پہ پاؤں دبا کے گاڑی دوڑا کے سڑک پہ ڈال دی۔
وہ آنسو اُسی کے پیروں پہ گر گیا۔
کدھر جا رہی ہو؟ میں ہولے سے بولا۔
پتہ نہیں۔

کہیں تو جانا ہوگا؟

جہاں رستہ لے جائے۔

رستہ تھوڑی لے جاتا ہے، جاتا تو مسافر ہے۔ یہ تو بھی رُکا رہتا، رستہ۔

ہاں، یہی رُکا رہا میرے لیے، یہ رستہ۔

پری نے چند سیکنڈ میں گاڑی بہت تیز کر دی۔ گاڑی کے "ڈیش بورڈ" سے ہلکی ہلکی ٹوں ٹوں پھر ہونے لگی۔ ایسی بڑی گاڑی میرے پاس سعودی عرب میں ہوا کرتی تھی۔ "ایک سو بیس" کلومیٹر سے تیز دوڑاتا تو ٹوں ٹوں کرتی جاتی۔ ایک بار وہ گاڑی میں نے "دو سو دس" کلومیٹر پہ دوڑائی تو میرے ساتھ بیٹھی میری بیگم چیخیں مارنے لگی۔ اُس دن پری کے ساتھ بیٹھ کے مجھے ڈر لگا کہ آج یہ میری چیخیں نکلوائے گی۔

میرا خیال تھا چیخیں سننے کا شوق صرف "بندے" کو ہوتا ہے۔

"پری" نے بھی شاید یہ شوق پالا ہوا ہو۔

"پری" کوئی بہت بڑی بات ہے۔

مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟

تم ہی سے تو کچھ نہ چھپا سکی۔

یاد ہے، اُس شام ریستورانت میں تمہیں کہا تھا، پہلے کیوں نہ ملے؟ کتنا وقت گزر گیا۔

ہاں تم نے کہا تھا۔

"وقت" بھی رستے کی طرح ہوتا۔

بس اِس میں چپ چاپ بہنا ہوتا ہے۔

کونسا وقت بہہ گیا، کس نے ابھی بہنا ہے،

یہ نہ سوچو۔

جو تمہیں پیار جتائے۔

اُس کو سنو۔

پری نے گاڑی کی سپیڈ اور بڑھا دی۔

گردن لمبی اوپر کیے وہ آگے دیکھتے دیکھتے ایسے میری طرف نگہ گھما کے وقفے وقفے سے تکتی بات کرے کہ اُس کے تکنے سے سینے میں ضرب لگے۔ بولی۔

تم سے پیار جتانے کو جو جتن تھے وہ کیے۔

مگر تم نے دیکھ کے بھی نہ دیکھا۔

یہی کہتے رہے۔

تکتی آنکھوں پہ اعتبار کرو۔

یاد ہے، اُسی ریستورانت میں کتنی بار ملے۔

تم نے مجھ سے کچھ نہ چھپایا۔

میں بھی تمہیں ہر بات بتانے لگی۔ اپنی کولیگ لڑکے لڑکیوں کی، شرارتوں کی، دل کے چھپے جذبوں کی، ہر طرح کی بات۔

ایک بار میں نے ہنستے ہوئے تمہیں اپنے موبائل پہ ایک تصویر دکھائی تھی۔

یاد؟

وہ، اُس بے قدرے کی فوٹو؟

ہوں۔ پری نے جیسے ایک ساتھ کئی آنسو پیے۔

یاد ہے تمہیں کہا تھا، یہ غلط آدمی ہے۔

ہوں۔ پری نے پھر سر ہلایا اور میری طرف گردن موڑ کے بولی۔

یہی تو پوچھنا،

تم آگے نگہ رکھو، میں نے سامنے سڑک کے موڑ کو دیکھ کے اُسے کہنی ماری۔

کیا پوچھنا؟

کیسے ایک نظر دیکھ کے آپ نے اتنی بڑی

بات کہہ دی تھی؟ پری نے موڑ مڑ کے پھر گاڑی تیز کر دی۔

بس، پری، میری چھٹی حس جو کہتی، وہ سن کے، سنا دیتا، ورنہ مجھے کیا پتہ ہوتا۔ تمہیں میری رائے بری لگی تھی، تھی نا؟

ہوں، اُس نے ہونٹوں کو تھوڑی اوپر اٹھا کے انہیں آپس میں کچلا جیسے انہیں کسی بات پہ سزا دے رہی ہو۔ بولی،

مجھے کیوں نہیں اعتبار آیا آپ کی بات پہ اُس وقت؟ یہ سمجھ نہیں آتی؟

ہوا کیا، پری؟

برا ہو گیا۔ اُس نے گہری سانس لی۔

تمہیں کہا تھا، اُس بندے سے بچنا۔

بچی؟

نہیں۔ وہ ایسے بولی جیسے رو دی ہو۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو لرز کے ٹپکے اور دونوں گالوں پہ موتیوں کی طرح پھسلنے لگے۔ اس بار اُس نے سٹیرنگ سے بائیاں ہاتھ اٹھا کے اُسے گالوں پہ ملا اور بولی، یاد ہے آپ کو۔ آپ پوچھا کرتے تھے، کون کون تم پہ مرا؟

میں مسکراتی۔

سوچتی تو کئی نام ذہن میں آتے۔ پھر مجھے جیسے ایسے کی کھوج ہو گئی، کون پاگل آنکھوں سے آپ کی طرح مجھے دیکھتا ہے؟

پھر وہ نظر آیا۔

میں نے موبائل پہ اُس کی تصویر اس لیے لے لی کہ آپ کو دکھاؤں گی۔

پھر دکھا دی۔

آپ نے دیکھتے ہی کہا،

نہ، یہ بندہ ٹھیک نہیں۔

کہا تھا نا آپ نے؟

ہوں، میں اب بھی اُس رائے پہ قائم ہوں۔

مگر مجھے آپ کی رائے کو پتہ نہیں کیوں غلط ثابت کرنا تھا۔

یہ آپ سے شدید الجھے ہوئے جذبے کی عجب کہانی ہے۔

میں اُسے سچا ثابت کرنے کے لیے اُسے کہہ بیٹھی، کہ سچے ہو تو سچ کر کے دکھاؤ۔

آپ کو بتایا تھا کہ میرے گھر اُس کے والدین اُس کا رشتہ لے کر آئے تھے۔

یہ جانتے ہیں آپ۔

میرے ابا نے منع کر دیا تھا انہیں۔ یاد آیا آپ کو؟

سب یاد ہے۔

تم نے کہا تھا کہ، وہ اس بات پہ تم پہ بہت چیخا تھا کہ انکار کر کے، تمہارے والد صاحب نے اُن کے والدین کی ''انسلٹ'' کی ہے۔ تم نے گڑگڑا کے اسے بہت صفائیاں بھی دی تھیں۔

ہاں، بہت اُس کی منتیں کی تھیں کہ ایسا نہ کہو۔

میں نے اُس سے اس بات پہ معافی تک مانگی تھی، حالانکہ مجھے پتہ بھی نہیں کہ میرے والد نے اُن سے کہا کیا۔

''پری'' تیز گاڑی چلاتی ہوئی، دور کہیں آسمان اور زمین کے درمیان دیکھے بولے جا رہی تھی۔ بولی، اُس کے والدین آئے تھے،

اتنا جانتی ہوں۔ والد نے انہیں کھانا کھلایا۔ ان سے کچھ حال احوال پوچھا۔
وہ باپ ہیں نا۔
جو اُن کے پوچھنے والے سوال، وہ میں تھوڑی جانتی۔
تم اس وقت اپنے باپ سے خفا بھی تھی۔ تھی نا؟
بہت زیادہ۔
تم کہتی تھی، ابا ''فیوڈل لارڈ'' ہیں۔ زمینیں ہیں اُن کی، کئی شہروں میں حویلیاں ہیں۔ فارم ہاؤسز ہیں، فیکٹریاں ہیں۔
ہاں،
مجھے دکھ ہوا تھا اُس وقت، کیوں میرے ابا نے ان سے اتنے سوال کیے، کیوں پوچھا کہ تمہارے خاندان میں کوئی اور بھی ڈاکٹر ہے؟ وہ چپ رہے۔
پوچھا کوئی انجینئر؟
وہ پھر چپ۔
کوئی فوجی افسر؟
وہ خاموش۔
اور کسی محکمے میں کوئی بندہ؟
انہوں نے ایک کلرک اور کچھ دفتریوں کے نام گنوا دیے۔
ابا کو کہتے ہیں، سن کے چپ لگ گئی۔
بے عزتی کا تو ابا نے کوئی لفظ نہ بولا تھا۔
یہ تو میری ماں بتاتی۔ پھر بھی میں باپ سے نفرت کرنے لگی۔ اُس بندے کو میں نے بہت منایا۔
یاد ہے پری تمہیں، یہ واقعہ سن کے کہا تھا، اب تو کبھی اس کا سوچنا بھی نا۔ وہ تمہارے ابا سے بدلہ لینے کے لیے تم سے کھیلے گا، یاد ہے؟
سب یاد ہے۔
اسی لیے تو یہ ''لاش'' اب تمہارے پاس آئی ہے۔
اُس نے گاڑی کے ایکسیلیٹر سے پاؤں اٹھا لیا، گاڑی دھیرے دھیرے رکنے لگی۔
اُس نے گردن موڑ کے مجھے ایسے دکھ سے دیکھا، جیسے لاش کی آنکھیں کہہ رہی ہوں کہ تم نے میری جان لی ہے۔
''ہائی وے'' پہ ایک ''ڈھابے'' کے پاس گاڑی رک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک دم کئی آنسو آ گئے۔
''پری'' کا چہرہ کملایا ہوا تھا۔
ایک بچہ بھاگتا ہوا، ہماری طرف آیا۔
پری یاد، تم نے اپنا چہرہ سٹیئرنگ پہ رکھ لیا، کہیں تمہارے آنسو وہ لڑکا نہ دیکھ لے۔
میں نے بھی شیشہ نیچے نہ کیا۔
تمہاری گاڑی کے شیشے بھی تو نیم کالے تھے۔ بلیو گرے۔ ایسا لگے باہر بادل چھائے ہوئے۔ بادل تھے، مگر گاڑی کے اندر۔ پری تیری آنکھوں میں۔ وہ برس رہے تھے۔ باہر ڈھابے کا بچہ کھڑا تھا۔
وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے کہے، کہیے؟
میں نے اشارے سے اُسے کہا، ماسک پہن کے آؤ، ''کرونا'' کے دن ہیں۔ وہ پلٹ گیا تو میں نے تیرا سر اٹھایا تھا۔ تیرا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔
پری۔

تم نے میری بات نہیں مانی تھی کیا؟
نہیں، مجھ سے غلطی ہوگئی۔
تم ایک دم پھر آنسوؤں سے لرزنے لگی۔
میں نے تمہاری کمر پہ ہاتھ رکھا تو تم بلبلا کے رو پڑی اور سر اٹھا کے میرے گھٹنوں پہ رکھ دیا۔ میں ہولے ہولے تمہاری کمر سہلاتا، تمہارے ریشمی سنہرے بالوں کو سکارف کے اندر اندر ہی ہاتھوں سے استری کرتا ہوا، دوسرے ہاتھ سے تمہارا چہرہ تھپتھپانے لگا۔
تم نے رو رو کے میرے گھٹنوں پہ میری پتلون بھگو دی۔ میرا جی چاہے، تمہیں کھینچ کے اپنے سینے سے لگالوں اور پھر کہوں، کہو۔
ساری بات کہہ دو۔
کردو اپنے اندر کا سارا غبار باہر۔
کچھ نہ اپنے اندر رکھو۔
ورنہ گھل گھل کے گھل جاؤ گی۔
میں یہ سب تم سے کہنا چاہتا تھا، مگر کہا نہیں۔
تم نے ان کہی بھی سن لی۔
اپنا چہرہ دونوں ہاتھ سے پونچھ کے تم پھر اپنی سیٹ پہ کمر ٹکا کے بیٹھ گئی۔
باہر کھڑکی کے، ڈھابے والا لڑکا عجیب سا بے ہنگم اونچا نیچا سا پرانا اک پھٹا ہوا ماسک پہن کے آ گیا، تمہاری اُس پہ نظر پڑی تو تم روتی روتی ہنس پڑی۔
میری پری۔
میں نے تمہیں بازوؤں میں لے لیا۔
باہر ڈھابے والا دیکھتا ہے تو دیکھتا رہے۔ وہ اپنے ماسک کے اندر ہنستے ہوئے کھڑکی کے شیشے کے قریب ہوا تو اُسے اشارے سے دو کوک لانے کو کہا۔ وہ بھاگ گیا سن کے۔
بول پری، ساری کہانی بول۔
ورنہ میں سنا دوں، تم پہ کیا بیتی؟
تم نے آنکھیں پونچھتے ہوئے انہیں پھیلا کے کہا۔
کہو۔
تم نے جب اُس کی منت کی ہوگی کہ والدین کی بے عزتی کی غلطی معاف کردو، تو اُس نے تمہیں کہا ہوگا، کہ میرے پاس آؤ۔
کہا تھا اُس نے؟
ہاں۔ کہا یہی۔
پھر تم گئی؟
جی گئی۔
او۔
کدھر لے گیا وہ تمہیں۔ بولی پری؟
تم کچھ دیر چپ رہی۔
سوچتی رہی، کہوں یا نہ کہوں۔
اتنے میں ڈھابے والا بچہ دو بوتلیں کھٹکھٹاتا ہوا، اُن میں سٹرا ڈالے آ گیا۔ میں نے شیشے نیچے کر کے دونوں بوتلیں پکڑ کے اُس سے پوچھا، کھانے میں کیا کچھ ہے؟ وہ تیز تیز کچھ نام بولنے لگا۔
تم نے تھکے تھکے سے جسم سے نفی میں سر ہلایا۔
مجھے محسوس ہوا پری، تم پہلے سے کتنی نحیف ہوگئی ہو، مگر میں یہ بولا نہیں۔ کہا صرف میں نے یہ تھا کہ، پری، کچھ تو کھانا پڑے گا، ادھر اس کے پاس رکے ہوئے جو ہیں۔
تم نے اشارہ کیا، اچھا، بتاؤں گی۔

ذرا ٹھہر کے۔
میں نے لڑکے کو ٹال دیا کہ، بتاتے ہیں بوتل پی کے۔ پھر تمہارے ہاتھ میں کوک پکڑا دی۔
پوری نہیں پی ہونی، مجھ سے۔ تم ہولے سے بولی۔ تم نے اُس بوتل کا سٹرا نکال کے میری بوتل میں ڈال لیا اور روہانسے چہرے پہ عجیب سی والہانہ مسکراہٹ لا کے بولی،
تمہارے ساتھ ''سپ'' لوں گی۔
دونوں گھونٹ گھونٹ پیتے۔
میرا نہ گھونٹ بھر لینا، میں ہنسا۔
تمہی نے گھونٹ نہیں بھرنے دیا۔ کسی اور کا گھونٹ بن گئی۔
واقعی؟ میری صدمے سے آنکھیں پھیلی۔
ہاں۔ تم گھونٹ لیتے لیتے پھر رو پڑی۔
مجھے پوری بات بتاؤ۔
ہم ایک دوسرے کو اپنی بیتی باتیں بتاتے تھے۔ تم بھی مجھ سے کچھ چھپایا نہ کرتی۔ کبھی تم مجھے ''آپ'' کہتی کبھی ''تم''۔
دھیرے دھیرے پری تم میری ''تم'' بنتی جا رہی تھی۔
پھر یہ صدمہ لے کر تم آ گئی۔
تب میں نے تمہارے کندھے پکڑ کے تمہاری ہیرے کی سی اجلی شفاف آنکھوں میں لرزتے آنسو دیکھ کے کہا، ساری بات کہو، پری۔
وہ کہتا تھا، میں کیسے اب تمہارا یقین کروں؟
میں کہوں، جیسے تمہیں یقین آتا، وہ کرتی۔
اُف۔
تم نے یہ کہہ دیا؟
میرا سوال تمہارے چہرے میں جیسے میخ بن کے چبھا۔
تمہارا گلاب چہرہ کملا یا۔
تم گھونٹ کھینچتے کھینچتے ''کوک'' میں لرزتا اپنا سانس بھر گئی۔ ''کوک'' بوتل کے پیٹ میں بلبلے اڑے اور میں گھونٹ لیتے سمے، بوتل میں چھوڑا ہوا تمہارا سانس پی گیا۔
میرے سانس بے ترتیب ہونے لگے۔
میرا دل تیز دھڑکے۔
تیرے سنہری بال سکارف کی اوٹ سے نکلے تمہارے چہرے پہ گاڑی کے ''ایئر کنڈیشنر بلوز'' سے میرے چہرے کی کنیوں پہ سرسرانے لگے۔
پری یاد،
تم نے پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ تم مجھے اپنے سنہری بال سارے کبھی کھول کے دکھاؤ گی، یاد جب تمہارے بالوں کی ایک لٹ تمہارے بائیں گال پہ لرزتی دیکھی تھی۔
یاد آیا؟
تمہارا وعدہ تھا۔
یاد ہے۔
لو، دیکھ لو، تم نے یہ کہتے ہوئے اپنا سکارف کھول کے گود میں ڈال لیا۔ اور تمہارے سنہری بالوں نے تمہاری ساری سیٹ بھر دی۔ پوری گاڑی سنہری ہو گئی۔ سر سے پاؤں تک تمہارا سنہری پن رو رہا تھا۔ تمہاری گود سے سرکتا تمہارا آسمانی سکارف تمہاری رانوں پہ تنی نیلی جین کی زپ کے آگے موٹی سفید

سلائیوں کے دھاگوں سے الجھا ہوا تھا۔

میں نے تمہارے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تمہیں زور سے قریب کیا، تمہارے گلاب چہرے کی آنکھیں، میری آنکھوں کے اتنی قریب آ گئیں کہ تمہاری پلکیں جھلملائیں تو وہ مجھے اپنی آنکھوں پہ سرسراتی محسوس ہوئی۔

پری تم کتنی حسین ہو، تمہیں کبھی بتایا ہی نہیں۔

تمہاری آنکھیں کتنی معصوم۔

بچوں کی سی آنکھیں۔

حیرت سے بھری۔

اُس دن عجیب گہرے دُکھ سے لتھڑی جیسے اُس پرندے کی آنکھیں، جسے کسی نے شکار کر کے، ادھ موا چھوڑ دیا ہو۔

پری ایسی آنکھیں میں نے ایک بار پھڑ پھڑاتی ہوئی، پانی اور گھاس پہ گری، گر گر کے اٹھتی، پَر مار کے اڑنے کی کوشش میں گِلی، ایک مرغابی کی دیکھی تھیں، جسے اوپر دریا کنارے اپنے شاہانہ غول میں ''وی'' فارو کٹری کی نوک بنے آسمان پہ اڑتے دیکھ کے میں نے اپنی بندوق سے گرایا تھا۔

پری،

پتہ نہیں، ہم انسانوں میں کیا ''کمپلیکس'' ہے کہ جو ہمیں اپنے آسمان پہ اوپر، حسین، حسن سے اُڑتا، بھاگتا نظر آئے، اُسی کو ہم گرانے کی خواہش پال لیتے،

ہے نا؟

تم میری یہ بات سن کے عجیب طرح چونکی تھی، میں اپنی ''کہانی'' کہنے کی لذت سے لتھڑا اُسی کے مزے میں بہا جا رہا تھا۔

پری، میرے نشانہ لے کر فائر سے وہ مرغابی آسمان پہ بادل کی سی اونچائی سے، کسی پتھر میں لپٹے ہوئی کاغذ کے سندیس کی طرح، کپکپا کے گری تھی۔ پانی اور اونچی گھاس میں اُٹھا اُٹھ کے اڑتی وہ۔ اُڑ اُڑ کے گرتی، گولی اُس کے بائیں پَر کے کندھے میں لگی تھی۔ وہ ایک پَر کے ساتھ ساتھ پھڑ پھڑائے، اچھل اچھل کے سرکتی جائے۔ میں شکاری کتے کی طرح بندوق ہاتھ میں لیے، اونچے گھٹنوں تک ربڑ جوتے پہنے، پانی اور گھاس میں تھڑل تھڑل کرتا پاؤں مارتا پکڑنا اُس تک جا پہنچا، بندوق گلے میں لٹکائے میں نے ہاتھ بڑھا کے ٹوٹے پَر والی مرغابی جا پکڑی۔

جیب سے چاقو نکال کے مرغابی کی شہ رگ کاٹنے لگا تو اُس نے ایسی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

جیسے پوچھ رہی ہو، میں نے تیرا کیا بگاڑا؟

مجھ سے تیری کیا دشمنی ہے؟

کیا قصور میرا؟

اُف۔

اُس کی آنکھیں پوچھے جائے۔

سوال ہی سوال۔

مجھے زندہ رہنے کا حق نہیں؟

میری زندگی ختم؟ تمہارے پاس بندوق اور چاقو۔

مجھ سے چاقو نہ چلا۔

میرے ہاتھ سے وہ پھسل گئی۔

پھر اُس نے زخمی پَر مار کے اڑنے کے جتن بھی نہ کیے۔ پانی، گھاس میں وہ میرے ہاتھ میں

سسکتی رہی۔ تب پتہ نہیں، کیوں اُس مرغابی کا درد میرے سینے میں زخمی ہوئے بچے کی طرح کلبلانے لگا اور میں رو دیا۔

پری اُس دن کے بعد میں نے اپنی بندوق سے کبھی مرغابی نہ گرائی۔ کوئی پرندہ نہیں گرایا۔ زخمی مرغابی کی دریا کنارے بیٹھ کے، ساتھ لائے ''فسٹ ایڈ بکس'' سے مرہم کی۔ مرغابی اٹھا کے ساتھ لے آیا۔

اُس مرغابی کی ہر بات مجھے سمجھ آتی تھی۔ دیکھ، پرندوں، جانوروں کی بولیاں، جب چاہے، خدا بندے کو سمجھا دے۔ یہ سمجھ میں آ جاتیں۔ کوئی انہیں سمجھنا تو چاہے۔

اُس مرغابی کا پَر ٹوٹ گیا تھا۔ دیکھ ہماری ہڈی کا فریکچر بھی تو ٹھیک ہو جاتا۔ وہ بھی صحت یاب ہو گئی۔

جس روز اُسے اڑانے میں اُس دریا کنارے آیا تھا، اُس کی آنکھوں نے بھی کچھ کہا تھا۔

جب میں نے مرغابی کی آنکھوں کو چوم کے اپنی آنکھوں سے ٹپک آئے آنسو اُس کی چونچ پہ تھرتھراتے دیکھے،

تو پری،

اُس کی آنکھیں مجھے محبوبہ کی آنکھیں لگی تھیں۔ بالکل تمہاری آنکھوں جیسی

اُسے ہاتھوں میں پھیلا کے چھوڑا، تو، اُس نے اپنی چونچ سے میرے داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی کی آخری پور کو چوم کے اپنے پَر پھیلائے، ہاتھوں سے نکل کے پہلے ایک محبت بھری چھلانگ لی، گھاس اور تھتھلے پانی کے سطح پہ کچھ بارا اچھل اچھل کے اڑی اور پھر اڑان بھر کے آسمان پہ اڑ گئی۔

پری تمہیں کیا بتاؤں۔

اُسے آسمان پہ اونچی ہوتی، اڑتی دیکھ کے دل کتنا خوش ہوا تھا۔

اُس وقت پھر آنکھوں سے آنسو آ گئے تھے۔

دیکھ

شکاری کہا کرتے تھے،

شکاری کو سب سے زیادہ مزا، آسمان سے گرتے شکار کو دیکھ کے ہوتا ہے،

پتہ نہیں، میں شکاری قبیلہ سے نکل آیا۔

مجھے شکار ہوئے، گرے گھائل پنچھی کو پھر سے اڑا دینے میں سب سے زیادہ لطف آیا۔

پری، ہر شخص کا بھی ایک حیوانی ہیولہ ہوتا۔

جانتی، تمہارا وہ ہیولہ کیا ہے؟

تم منہ کھول کے بولی، کیا؟

''مرغابی''

تم مسکرا کے بولی، زخمی مرغابی۔

نہ، زخمی مرغابی کا زخم سینا مجھے آتا۔

میں نے پھر تمہیں کندھوں سے پکڑ کے ساتھ بھینچا تھا۔ تمہارے سنہری بال تمہاری سیٹ سے اُٹھ کے میرے بازوؤں میں سرسرائے۔ وہیں میرے دائیں بازو میں تم سر دیے، سر جھکائے سسک رہی تھی۔

نہ، ایسے نہیں۔

دیکھ تو ''گدھوں'' لومڑیوں اور لگڑ بگڑ بھری دنیا سے دور پلی۔ تیرے ''فیوڈل لارڈ''

باپ نے تمہیں اس بستی کے بستے لوگوں
کے بھاری بستے کمر پہ کھینچتے بچوں سے دور
رکھ کے پالا۔
تم نے تو کالج آتے آتے بھی اپنی کتابیں
کاپیاں اپنے ہاتھوں میں نہ اُٹھائی تھیں۔ ایک
تمہارے پیچھے چلتا، دو قدم پہ ایک بندوق
لٹکائے "گن مین" تمہارا پہرے دار بنا چلتا۔
ڈرائیور تمہارے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتا۔
تم نے تو گاڑی کا دروازہ خود کھولنا تب
سیکھا، جب تم گاڑی کے سٹیرنگ پہ بیٹھ گئی۔
پری تم نے اپنا جیون، یہاں کی بستی سے
بہت دور، سجے ہوئے ہرے بھرے ٹھنڈے
بخ سائبیریا میں گزارا۔
ایک مرغابی کی طرح۔
میڈیکل کالج میں تو پڑھی۔
کالج میں "بیڈمنٹن کورٹ" میں تم اچھل
اچھل کے شارٹ لگاتی۔ ٹینس کے ریکٹ کو
تلوار کی طرح چلاتی۔ تم نے ڈیبیٹنگ کلب
میں بھی "فیوڈل ازم" کے خلاف تقریریں
کی، مگر تمہیں اس فیوڈل ازم کی سمجھ نہ آئی۔
دیکھو، تیرے باپ کا قصور نہیں۔
اگر انہوں نے اُس بندے کے والی وارثوں
سے "وراثتوں" کا پوچھا۔
دیکھ پری۔
فیوڈل ازم میں بندے کو اس کے باپ دادا
کے حوالوں سے ہی تولہ جاتا۔ تولتے وقت
وہ یہ بھی دیکھتے کہ اس بندے اور اس کے
بڑے بڑوں کے پیروں کے نیچے کتنی زمین،
اُن کی اپنی ہے؟
اگر تیرے ابا نے اُس بندے سے یہ سب
پوچھا، جس کے والدین ایک پانچ مرلے
کے مکان میں آٹھ بچوں کے ساتھ جیتے
ہیں تو یہ تیرے باپ کے فیوڈل قبیلے کی
مجبوری ہے۔
پانچ مرلے والے گھر میں رہنا کوئی شرم کی
بات نہیں، مگر تیرے باپ نے سوچا، یہ بندہ
پانچ مرلے سے اُٹھ کے پانچ کنال والے
گھر میں چھلانگ مارنا چاہتا ہے، یہ میری
بیٹی کو اپنے والدین کی محرومیوں کا بدلہ لینے
کے لیے، ٹکٹکی پہ نہ باندھ دے۔
اُس نے وہی کیا؟
ہے نا؟
میرا دل تمہیں اپنے بازوؤں میں لے کر بہت
کچھ پوچھنے کو کر رہا تھا۔ تم میری گود میں رکھی
"کوک" میں میرے ڈالے "سٹرا" کے ساتھ اپنا
"سٹرا" جوڑے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی
کچھ کہنے نہ کہنے کی صلیب پہ ٹنگی ہوئی تھی۔
دیکھ، تیری ان کہیاں میں نے سن لی تھیں۔
وہ تو، تم جب کوک سے گھونٹ کھینچتی تو تیرا
گلاب گال میرے گال کو چھوجاتا۔
میرے حلق میں رکی سانس، رک جاتی۔
تیرے ہونٹ پھڑ پھڑاتے۔
میرے ہونٹ ہچکچاتے۔
دونوں سٹرا کو تم نے جوڑ کے ایک کر لیا تھا۔
پھر دونوں سے ایک گھونٹ تم نے لیا۔
میں تیرے ہونٹوں سے اپنی باری کا گھونٹ

پینے کے لیے، تیرے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ
گھسا کے دونوں سٹرا کھینچتے ہوئے کپکپا گیا۔
تیرے ہونٹوں کے شہد میں اداسی بھری تھی۔
میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔
تب تیرے ہونٹوں پہ سانس کا گھونٹ بھر
کے، میرے ہونٹوں نے تیرے ہونٹوں پہ
سرسرا کے سرگوشی کی تھی۔
وہ تمہیں کدھر لے گیا؟
تیرے ہوٹوں نے پھڑ پھڑا کے بم پھوڑا
''کورٹ'' میں۔
گود میں اوپر سیدھی کھڑی بوتل لرزی۔
گرتے گرتے بچی۔
کیوں؟
بولا وہ، کہ تمہاری بات کا مجھے یقین تب
آئے گا، جب میری بات مانو۔
کونسی بات؟
''کورٹ میرج''
او میرے خدا، اتنا بڑا انتقام لیا اُس نے۔
مجھے یاد، تم سر پہ ہاتھ پھیر کے، اپنے سنہری
بال پھیلا کے، سیٹ کے ساتھ سر لگا کے
سسکنے لگی۔
تمہیں کہا بھی تھا، کہ وہ تم سے بدلہ لے گا۔
کہا تھا کہ نہیں؟
صاف، لفظوں میں ٹھہر ٹھہر کے کہا تھا۔ یاد
ہے کہ نہیں۔
یاد ہے۔
پھر کیسے بھول گئی؟
اُس نے بھلا دیا۔
تمہیں کیا اُس سے محبت تھی؟
نہیں۔
پھر کیا تھا۔
مجھے لگتا تھا، وہ مجھے پیار کرتا ہے۔
کیسے لگتا تھا یہ؟
دیکھ، دو چیزوں نے مجھے مروایا۔
تم ایک دم سر اٹھا کے، چہرے پہ آئے اپنے
سنہرے بال جھٹک کے میری آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کے شکایت کرنے کے انداز
میں بولی۔
دو چیزوں نے
پہلی کونسی،
تمہارا ناول، ''دروازہ کھلتا ہے''
میں ہنسنے لگا۔
اُس معصوم کو کیوں الزام دیتی ہو۔
سچ کہتی ہوں۔ تم نے، ناول میں، محبت کو ایسی
طلسماتی آفاقی قوت کے طور پہ لکھا، کہ جو پڑھے اس
کے سحر میں ڈوب جائے۔ لڑکی کوئی بھی پڑھے تو وہ،
تمہاری ''تم'' خود کو محسوس کرتی ہے۔
کبھی اُسے اپنا چہرہ، اپنا جسم ''صاحباں'' کا
لگتا، وہ قدم قدم چلتی تو اُسے اپنے پیروں
سے چھنا چھن کی لفزئی آواز کانوں میں
آتی، وہ رکتی تو اُسے لگتا، کائنات اُس کے
ساتھ آ کھڑی ہوئی۔
یہ مغالطے سارے تم نے بانٹے۔
میں سر جھکائے تمہیں سنتا رہا۔
کونسا ایسا لڑکی کا روپ ہے، جو تم نے اپنے
ناول میں نہیں لکھا؟

''ارجمند بانو'' پڑھو تو خود میں ''لال قلعہ''
ملنے لگتا۔
''رانی چانن کور'' پڑھتے چلو چانن راہ
آنکھیں تکنے لگتی ہیں۔
سائیں بگو شاہ کی ''زینب'' رات دیے کی
روشنی میں پوری روح میں محبت کے پھول
ٹانک دیتی ہے۔
تیری ''ہربنس کور'' کی چال میں ہر لڑکی کو
اپنے لیے قدم لگتے۔
''شانتی'' کی سچائی اپنی روح کا انت محسوس
ہوتی ہے۔
اُدھر تو ''ہرنام کور'' بھی ہے جو پراندہ گھما کے
کہتی ہے، میرے پیچھے آیا تو وڈیا جائیں گا۔
میں بھی دل ہی دل میں سوچتی۔
کوئی تو میرے پیچھے آئے۔
میں ہنسنے لگا۔
دیکھ، میں سچ کہہ رہی ہوں۔
مذاق میں نہ ٹالو۔
تیرے ناول نے مجھے ''سحر زدہ'' کر دیا تھا۔
میں نے ''مفتی جی'' میں پڑھا تھا کہ ممتاز
مفتی کہتے تھے، ''وہ لڑکی شکرانے کے دو نفل
پڑھے، جسے تم نے خط نہیں لکھا۔''
میں کہتی ہوں،
وہ لڑکی چار نفل شکرانے کے پڑھے جو
تیرے ناول کی جادوگری سے بچ گئی۔
تم ''جادوگر'' ہو۔
''مائی میراں'' کوئی لڑکی پڑھے اور محبت
کے جذبوں سے عاری رہے، ہو سکتا ہے؟
بس تمہارے ناول نے مجھے یہ سوچنے پہ مجبور
کیا کہ کوئی ہے؟
لو، تم پہ تو ہزار مرتے ہوں گے، پری۔
ہوں گے۔
بچپن، لڑکپن میں بھی مرے ہوں گے؟
مرے یا نہیں؟
نہیں - میرے ''فیوڈل لارڈ'' باپ کی
وحشت سے کون میرے قریب آتا؟
پھر یہ کیسے تمہارے قریب ہوا۔
بس اتفاق سے ہسپتال سے نکلی، وہ اپنے
موٹر سائیکل کو سٹارٹ کرنے میں لگا تھا، اچھل
اچھل کے پتلون اوپر کھینچ کے پاؤں مارے،
موٹر سائیکل ایک مرے ہوئے مینڈک کی
طرح ہولی سی اک ٹرکرے، یہ پھر اچھلے۔
وارڈ میں میرے ساتھ اس کی ڈیوٹی تھی۔
بس جیسے دو ڈاکٹر، پیشہ وارانہ بات کرتے
ایسے اُس سے بات ہوتی۔
وہ تمہارے کالج کا نہیں تھا؟
نہیں۔
ہاؤس جاب میں ساتھ تھا، بس۔
پھر؟
میں ہسپتال کے پورچ سے اپنے گاڑی
''ریورس'' کرنے لگی تو اس کا پاؤں میری
گاڑی کے ٹائر نیچے آ گیا۔
او۔
میں نے ''سوری'' کہا۔
وہ پاؤں اٹھا کے منہ میں پھونکیں مارنے لگا
جیسے بہت درد ہوا ہو۔

بن رہا تھا، اب سمجھ آ گئی۔
اُس نے خود بعد میں بتا دیا تھا کہ جوتے پہ ذرا سا ٹائر چڑھا تھا تو اُس نے چیخ ماردی۔
میں گاڑی کھڑی کر کے اتر آئی۔ بس اسی دن اپنی غلطی کی تلافی کرنے کے لیے اُسے کہہ دیا، ہوسٹل تک "ڈراپ" کردوں؟
پھر؟
وہ ایک دم اپنا کھچاڑا موٹر سائیکل کھینچ کے کسی کونے میں رکھ کے اپنے کالے ہوئے ہاتھ ملتا ہوا آ گیا۔
میں نے کہا، بیٹھو۔
سفید نئی زیرو میٹر گاڑی تھی اُن دنوں ابا نے مجھے لے کے دی، اُس کا ہینڈل کھولنے لگا تو سارا ہینڈل کالا کر دیا۔ میں کچھ نہ بولی۔
لگتا، پری آنکھیں بولی ہوں گی؟
تمہاری آنکھیں تو خون میں دھنس کے بولتی، میں ہنسنے لگا۔
گاڑی کے اندر بیٹھ گیا تو اُسے ڈیش بورڈ سے کھینچ کے ٹشو پیپر دیا وہ اُس سے ہاتھ پونچھنے کی بجائے اُسے سونگھنے لگا۔
بولا، بڑی خوشبو ہے اس میں۔
بس اِسی طرح کی بے جوڑ تعریفیں اُسے کرنا آتی تھیں۔
اب سوچتی ہوں،
تعریفیں وہ میری نہیں، میری چیزوں کی کرتا تھا۔
کبھی پھیل کے گاڑی میں بیٹھ کے کہتا،
بہت ٹھنڈی گاڑی ہے آپ کی۔
سیٹ دیکھ کتنی نرم۔
او، یہ ہائی فائی سسٹم کیسا شاندار۔
تم اُسے بٹھا کے گانے سناتی تھی؟
میں ہنسا۔
ہاں، میرے اندر تمہارے "ناول" کی بسائی پرانی روح ہے۔ پرانے گانے لگا لیتی اُس نے کبھی کسی گانے کے بولوں پہ غور ہی نہ کیا۔ کہتا تو یہ بول دیتا، تیری گاڑی کے سپیکر بڑے جاندار ہیں۔
تم اُس کو ساتھ لیے گاڑی پہ پھرتی رہی؟
بس ہسپتال سے کچھ بار وہ راہ میں اپنے ہوسٹل اترا۔
کیوں؟
اُس کا موٹر سائیکل مستری کے پاس تھا۔ بس ایسے ہی پتہ ہی نہ چلا، کب قسمت پھوٹی۔
کیوں؟
ہسپتال میں لمبی نائٹ ڈیوٹی۔
اول فول باتیں۔
اُس نے پوچھ لیا، شادی کس سے کرو گی؟
میں نے اپنی متانت میں کہہ دیا، جدھر والدین کریں۔
بولا، تمہارے گھر تمہارے رشتے کے لیے لوگ آتے ہیں؟
میں نے کہہ دیا۔ آتے ہوں گے۔
بولا، کسی غریب کے گھر والے اگر اُدھر تمہیں مانگنے پہنچ جائیں تو؟
میں اپنے عجز میں گڑ گئی۔ ہولے سے بولی، اس سے کیا ہوتا۔
بس، یہ شاید اُس نے میری طرف سے اظہار محبت سمجھا۔ خدا جانے اُس کے دل میں کیا

آیا۔ اپنے والدین کو میرے گھر بھیج دیا۔
باقی کی باتیں تمہیں بتا چکی۔
گاڑی کی کھڑکی کے ساتھ، پھر ڈھابے والا
بچہ آ کھڑا ہوا۔
اُس نے چہرے پہ اپنا پھٹا ہوا، اوپر نیچے
بے ڈھبا سا ماسک سیدھا کرنے کی کوشش
کر کے، بند شیشوں پہ انگلیاں بجائیں۔
اُسے دیکھ کے تم پھر مسکرا پڑی اور بولی۔
دوسرا، اس ''کرونا'' نے مجھے مروایا۔
''کرونا'' نے کیسے؟
جن دنوں وہ مجھے طعنے دیتا کہ تم لوگ اپنی
دولت کے نشے میں غریب لوگوں کی ہتک
کرتے ہو تو میں اُسے سمجھاتی کہ میں ایسی
نہیں مجھے دولت کو کیا کرنا ہے۔
میں تو محبت ڈھونڈتی ہوں۔
سچ پوچھو تو میری تلاش یہی ''محبت'' تھی۔
بچپن سے میرے گرد چار چار نوکر تھے۔
لیکن دو بول پیار کے بولنے والا کوئی نہیں،
چھوٹے ہوتے گلی محلے کے بچوں سے کھیلنے
کا جو سواد ہو سکتا تھا، وہ بھی نہیں چکھا۔
بس بڑی، پھیلی ہوئی حویلی۔
اندر مالی۔
مالنیں۔
جھولے۔
مگر ساتھ جھولنے والا کوئی نہیں۔
دو بھائی ہیں، وہ عمر میں کافی بڑے۔ میں
جھولے پہ بیٹھنے لگی تو وہ گاڑیاں دوڑاتے
پھرتے۔ اُن کی اپنی دوڑ دھوپ۔
ابا کے پاس حالی موالی۔
یا کاروباری دوست۔
انہیں پیسے کمانے کا جنون۔
جیسے دریا میں کنڈیاں ڈال کے مچھلیاں
پکڑنے والے کے ہاتھ میں جال آ جائے۔
ابا کے پاس پیسے کی ریل پیل۔ وہ پراپرٹی
خریدنے بیچنے میں لگے۔ اُدھر زمین سستی،
اُدھر ریٹ بڑھ گئے۔
وہ خرید لو۔
اُسے بیچ دو۔
گھر کی بیٹھک میں کبھی بیٹھتے بھی تو اُدھر بھی
اپنا کاروباری دفتر سجا لیتے۔
رشتے دار دور۔
ابا برادری میں اتنے اونچے ہو گئے کہ باقی
لوگ سہمے ہوئے ملنے سے کتراتے۔
ماں تھی، وہ بیمار۔
جوڑوں کے درد کے ٹیکے اُدھر سے لگوا، اُسے
دکھا، زنان خانے میں پڑی عورتوں سے
ٹانگیں دبواتی رہتی۔ میں کسی کو نظر ہی نہ آئی۔
بس، اگر کوئی پوچھتا تو یہ، بولو کیا چاہیے؟
گاڑی بدل دوں؟
نوکر اور چاہیے۔
لو جیب خرچ اور لے لو۔
بس گھر میں میرے لیے ہر طرف آسائشیں تھیں۔
میں اُن کے نیچے دب کے مر گئی۔
پیسے بہت تھے، پیار کے دو بول بولنے والا
کوئی نہ تھا۔
کوئی نہ تھا، جو اپنے بازوؤں میں لے کر

اپنے جسم کی حدت مجھے دیتا۔ میں برف کے گلیشیر پہ اُگی ہوئی کائی تھی۔ کونپل نہ تھی کسی گھاس کی۔

تم تو گلاب کونپل ہو۔

میں نے، یاد تمہیں بازوؤں میں لے لیا تو تم نے سہم کے گردن مرغی کی طرح نکال کے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

وہ ٹیڑھے پرانے ماسک والا بچہ وہاں سے کھسک چکا تھا۔

پھر تم اُس کا خیال آتے ہی بولی،

اس ''کرونا'' نے بھی مروایا۔ اس سے تو اچھا ہوتا، ''کرونا'' چمٹ جاتا۔ ''کرونا'' سے بچتے بچاتے، وہ چمٹ گیا۔

تم نے خود چمٹایا ہوگا، میں ہنسا۔

نہیں۔

میں تو حقیقت میں اُسے اُس دُکھ سے بچانا چاہتی تھی کہ اُس کے والدین کی میرے گھر میں کوئی بے عزتی ہوئی۔

اُسے یہاں تک کہہ دیا۔

اب بھیج دو۔

میں نے اپنی ماں اور بھائیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا کہ وہ ابا سے بات کرلیں۔

پھر تو تم نے اپنے باپ کا تختہ الٹ دیا۔

میں ہنسا۔

تم مسکرائی۔

بولی، پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔

تمہاری کہی باتیں مجھے یاد تو تھیں مگر اُس وقت بھول گئی میں سب، اوپر سے تمہارا موبائل آف۔ تمہاری حیراں حیراں بچوں سی معصوم شفاف بڑی بڑی آنکھیں میری آنکھوں پہ جمیں اور تم کپکپا کے خوف زدہ سی ہو کے بولی، سچ بتانا، کیا ''جادو'' ہوتا؟

ہوتا تو ہے۔

بس اُس نے ''جادو'' کرایا ہوگا۔

پھر تم کچھ آنکھوں آنکھوں میں سوچ کے بولی ہاں، ایک دو بار اُس نے مجھے اپنے گھر سے لائی ہوئی کھیر کھلائی تھی۔

میں ہنسنے لگا۔ میں مسکرایا۔

لو، پری جو ''جادو'' تمہارے حسن میں ہے وہ کسی کھیر کے نصیب میں کہاں؟

تمہارا ''جادو'' ایسا کہ کوئی پھیکا مقدر چکھ لے تو میٹھی کھیر بن جائے،

پری۔

تم نے میرا ہاتھ پکڑ کے دبایا، بولی سنو میں نے سنا ہے، میٹھی چیزوں میں ملا کے کچھ ''جادو'' کرتے لوگ۔

میں پھر ہنسنے لگا۔

تم بولی، کیوں ہنسے؟

کہا، ''جادو'' کے لیے میٹھی چیز کی ضرورت ہونہ ہو، صرف ''میٹھے بول'' کافی ہیں۔

تم نے پھر کھٹا سا منہ بنالیا، جیسے لیموں چوس لیا ہو، تم بولی۔ میٹھے بول تو اُسے مٹھاس سے بھر کے بولنے نہیں آتے تھے۔ میں تو اُس کے گلے شکوؤں کو محبت کی نشانی سمجھ بیٹھی، اوپر سے ''کرونا'' آ گیا۔

''کرونا'' نے تمہارا کیا بگاڑا؟

بار بار اس کا نام لیتی ہو۔
لو،
''کرونا'' کی وجہ سے وہ بندہ میرے قریب ہوا۔
''کرونا'' میں تو بندے، بندوں سے دور ہوئے، وہ قریب کیسے ہو گیا؟
یار، ہسپتال میں ''پروٹیکٹنگ کٹ'' پہنے ہوتے سارے۔ منہ پہ ماسک۔ چہرے پہ شیلڈ۔ اوپر ٹوپی، بدن پہ پھیلا ہوا ڈھیلا گاؤن۔ اس سارے سیاپے نے مجھے دیکھنے ہی نہ دیا، وہ ہے کیسا۔ بس پہلے کا وہ موٹر سائیکل سے کالے ہاتھ لیے اجڈوں کی طرح میری گاڑی میں چڑھا، یاد، یا پھر اپنے والدین کی بے عزتی کے لیے مجھے طعنے دینے والا فیوڈل نظام کے خلاف بولنے والا انقلابی۔
تمہیں اندر کا سچ بتاؤں، پری رازدارانہ انداز میں بولی۔
میرے اپنے اندر اس نظام کے خلاف لاوا پھوٹتا رہتا تھا۔
ایک تمہارا ''ناول'' دوسرا ''کرونا''۔
دونوں نے مجھے تل دیا۔
تیسرا تمہاری بے نیازی۔
تمہارے لیے ''خودکشی'' کی بھی بات کی،
تم نے اپنی باتوں کے ریشمی پھندوں میں وہ بھی اڑا دی۔
میں کدھر جاتی؟
تم کیوں نہیں بڑھے آگے؟
اپنا ہاتھ کیوں میرے ہاتھ میں نہ دیا؟
ریستورانٹ بھی سارے بند ہو گئے۔ تم سے ملاقاتیں کدھر کرتی؟
فون تم نے بند کیے رکھا۔
مرنا تو تھا میں نے۔
تم نے سلیقے سے مجھے مرنے بھی نہ دیا۔
کیسے ظالم ہو تم،
ہو، نا؟
تمہاری اجلی براق ہیرا آنکھیں، اُسی ''مرغابی'' کی نگہ لیے مجھے دیکھ رہی تھیں کہ میرا پَر کیوں توڑا۔ کیا بگاڑا میں نے تمہارا؟
کھڑکی کے باہر ڈھابے والا لڑکا پھر آ گیا۔ اُسے شیشے نیچے کر کے، کچھ کھانے کا آرڈر دیا، وہ گیا تو تم سے پوچھا،
تم پھر گئی؟
کہاں؟
''کورٹ میرج'' کرنے؟
ہاں۔
اُف۔
کسی سے مشورہ کیا، کسی سہیلی سے؟
نہیں۔ کسی ایک کو بھی نہیں بتایا۔
گئی کہاں؟
وہ ایک قریب ''ہل سٹیشن'' کی چھوٹی سی عدالت تھی میرا حال ایسا تھا۔ جیسے ڈور سے بندھی کوئی بکری ہو، خاموش۔ سپاٹ چہرہ منجمد جذبے۔ جہاں دستخط کرنے کا کہا گیا، وہاں کر دیے۔
پھر
میرا دل رک رک کے چلنے لگا۔ مجھے پتہ تمہاری

ہارٹ بیٹ بھی اُس وقت مِس ہو رہی تھی۔
میں نے تمہارے دونوں ہاتھ پکڑ کے اپنی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا ریشم کے بنے سارے پنے اندر ہی اندر لرز رہے۔ تمہارے دونوں ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ مجھ سے یہ بھی پوچھنے کی سکت نہ تھی کہ پھر؟
تمہاری آنکھوں میں موتیوں کی لڑی سسک کے اتری اور ایک دم تمہارے گال آنسوؤں سے چمکنے لگے۔ تم گال پونچھنے کے لیے ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی، میں نے تمہارے ہاتھ نہیں چھوڑے۔
تمہارے آنسو تیز ہو گئے۔
آنسو تمہارے ہونٹوں کی کنیوں پہ آ کے بلبلانے لگے تو تم ہونٹوں کو ایک دوسرے پہ چڑھا کے، انہیں پیستے ہوئے بولی،
پھر ساری رات وہ میرے جسم کو پھاڑتا، شکاری کتے کی طرح مجھے چاٹتا بھنبھوڑتا رہا۔
اور
صبح ہونے سے کچھ پہلے مجھے اُسی طرح گارے میں لت پت دلدل میں لیٹے چھوڑ کے، میرے گرے پھیلے ریشم کپڑوں سے اپنا میل پونچھ کے کچھ کہے بغیر چپکے سے اُٹھ کے باہر چلا گیا۔
وہ ہوٹل کا کمرہ تھا۔
میرا خیال تھا، وہ کسی کام سے نکلا۔
صبح ہو گئی۔
سورج چڑھ آیا۔
"ریسپشن" سے ناشتے کا وقت ختم ہونے کا فون آ گیا۔
اُس کا کوئی اتا نہ پتہ۔
کئی بار اُس کا موبائل ملایا۔
وہ آف۔
پھر؟
پھر، تم ایسے بلبلا کے چیخ مار کے روتے ہوئے مجھے لپٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔
بتاؤ نا، پھر کیا ہوا؟
پھر۔
تم سے بولا نہ جائے۔
تمہاری گردن کے پٹھے اکڑ گئے۔
تمہارا ریشم جسم ایسے ہچکولے لے، جیسے کشتی ساری جسم کی کسی طوفان میں ڈوبنے لگی ہو۔
بتاؤ نا، پری، کیا ہوا؟ پھر
تمہاری پری کا کلیجہ کاٹ کے اُس نے چبا لیا۔
کیا؟
کیا کیا اُس نے؟
آیا وہ، واپس۔
نہیں۔
پھر۔
موبائل پہ ایک "ایس ایم ایس" دیا۔
کیا؟
تم نے پھر چیخ ماری۔
اور تمہارے بلبلاتے ہونٹوں سے نکلا۔
ایک لائن کا میسج۔
"تمہیں طلاق دیتا ہوں"
اور تم روتی روتی میری گود میں بے سرت ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

''منزل''

سیما پیروز

بے جی صبح سے اندر باہر پریشان پھر رہی تھیں۔ اور مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

''اس نامراد بارش کو بھی آج ہی برسنا تھا۔ یہ بھلا کوئی بارشوں کا موسم ہے؟ اوپر سے گندم کی کٹائی شروع ہے اور ادھر بارش شروع ہو گئی ہے۔ جب بارش کی ضرورت تھی اس وقت بیچارے کسان بارش کے ایک قطرے کو ترستے رہے اور اب ضرورت نہیں ہے تو بے وقت کی یہ برسات ویسے ہی گندم کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے کہ قدرت بھی نامہربان ہو گئی ہے۔ موسم بھی عجیب بے اعتبارے سے ہو گئے ہیں۔ ساون سارا سوکھا گزر جاتا ہے اور کبھی بے وقت کی برسات شروع ہو جاتی ہے۔ صبح اچھا بھلا سورج نکلا ہوا تھا۔''

''بے جی درست کہہ رہی تھیں۔ صبح بڑی روشن اور چمکیلی تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ آسمان پر دور دور تک کہیں بادلوں کا نشان نہیں تھا۔ اچانک دس بجے کے قریب پورب سے ایسی کالی گھٹا اُٹھی کہ اس نے سارے آسمان کو ڈھانپ لیا اور شام سی پڑ گئی ۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہی موٹی موٹی بارش شروع ہو گئی۔ اور ساتھ ہی تڑ تڑ اولے برسنے لگے۔ ڈرا سی دیر میں لان کی

ساری گھاس سفید چادر سے ڈھک گئی۔ ایسی موسلا دھار بارش تھی کہ خدا کی پناہ۔ یاالٰہی میری بچی خیر خیریت سے پہنچ جائے۔"

"بے جی! کیوں خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ بارش ہی تو ہے تھم جائے گی۔ کسی نے انہیں تسلی دی۔

"جہاز کتنے بجے پہنچے گا؟"

"پانچ بجے۔"

"لو ساڑھے تین تو بج رہے ہیں اور بارش تھمنے کے کوئی آثار نہیں۔ جہاز تو خیریت سے اُتر جائے گا نا؟" وہ بے حد فکر مند تھیں۔

"آپ کمال کرتی ہیں صرف آپ کی بیٹی ہی تو اس جہاز سے نہیں آ رہی۔ تین سو مسافروں سے بھرا ہوا جہاز ہے۔ ان شاءاللہ خیریت سے پہنچ جائے گا۔" چھوٹی آپا قدرے خفگی سے بولیں۔

بے جی منہ ہی منہ میں کوئی وظیفہ پڑھتی ہوئی وہاں سے اُٹھ گئیں۔ تین روز پہلے ندا کے میاں کا مختصر سا فون آیا۔ "میں ندا کو بھجوا رہا ہوں۔ ایئرپورٹ پر ریسیو کر لیجیے گا۔"

"بیٹا تم خود کیوں نہیں آ رہے۔؟"

"مجھے ابھی چھٹی نہیں مل رہی۔ ویسے بھی وہ کچھ بیمار ہے۔"

بابا پوچھتے ہی رہ گئے کہ اسے کیا بیماری ہے کوئی پریشانی کی بات تو نہیں۔"

لیکن شرافت نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

ندا کی آمد کی خبر سن کر سب ہی خوش تھے لیکن ہر ایک کے تاثرات مختلف تھے۔ بے جی چونکہ ماں تھیں۔ "اللہ خیر کرے ابھی دو ہفتے پہلے تو میری اس کے ساتھ بات ہوئی تھی اس وقت تو اس نے پاکستان آنے کا ذکر نہیں کیا تھا۔" پھر خود ہی دل کو تسلی دی۔

"اچھا کیا پاکستان آ رہی ہے۔ خیر سے پہلی زچگی ہے۔ بہو! مجھے تو اب کچھ پتہ نہیں۔ تم ہی کسی اچھی تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر سے اس کے لیے ٹائم لے لینا۔ بچے کی ضرورت کی چیزیں بھی تم ہی خریدنا۔"

"آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ خیر سے آ تو جائے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چھوٹی آپا سدا کی دور اندیش "عجیب بے وقوف لڑکی ہے پاکستان آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈلیوری وہیں ہوتی تو بچے کو آسانی سے نیشنلٹی مل جاتی۔ پاگلوں کی طرح منہ اُٹھائے چلی آ رہی ہے۔"

"بھئی پہلا بچہ ہے۔ گھبرا گئی ہو گی اور پھر وہاں کون سنبھالتا۔" بے جی نے بیٹی کی حمایت کی۔

"تو وہاں کیا مسئلہ ہے ایک سے ایک اعلیٰ ہسپتال اور نرسنگ ہومز ہیں۔"

"اچھا بک بک نہ کرو۔" بے جی نے بیٹی کو ڈانٹ پلائی۔

ندا ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھی، شادی کے بعد وہ امریکہ چلی گئی تھی۔ اب

ڈیڑھ برس کے بعد پہلی بار آ رہی تھی۔ بے جی سے تو وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری دنیا کی گھڑیوں پر پانچ بجا دیں۔ جہاز نے لینڈ کیا۔ پھر ایک ایک کر کے مسافر آنا شروع ہوئے سارے گھر والے بڑے اشتیاق سے لاؤنج میں سے نکلنے والے مسافروں میں ندا کو تلاش کر رہے تھے۔ بہت انتظار کے بعد ندا پر نظر پڑی۔ مگر یہ کیا! ایئر ہوسٹس اسے سہارا دے کر لیے آ رہی تھی اسے دیکھ کر بے جی کی چیخیں نکل گئیں۔ یہ تو وہ ندا نہیں تھی۔ جسے ڈیڑھ سال پہلے بڑے ارمانوں اور خوشیوں سے روانہ کیا تھا۔ یہ تو اس کی پرچھائیں بھی نہیں لگ رہی تھی۔ انتہائی زرد، کمزور، بھونسلے رنگ کے اُجڑے ہوئے بال، ملگجا لباس اور آنکھوں میں وحشت کا بسیرا۔

''ہائے میری بچی! تجھے کیا ہوا؟ تیری یہ حالت کیسے ہوئی۔'' بے جی ندا کو گلے لگا کر چیخیں مار کر رو پڑیں۔

''بے جی پلیز چپ کریں ایئرپورٹ پر تو اس طرح کا تماشا نہ کریں۔ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔'' بڑے بھیا نے بڑی مشکل سے ندا کو بے جی کے کلاوے سے چھڑوایا اور ان کو ہلکی سی تنبیہ کی۔

جس دن سے وہ آئی تھی بے جی کے آنسو خشک نہیں ہو رہے تھے۔ سب پوچھ پوچھ کر ہار گئے تھے۔ مگر وہ کچھ بتا ہی نہیں رہی تھی۔ اس کی حالت عجیب سی تھی۔ نہ اسے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ پہننے اوڑھنے کا۔ اگر کوئی زبردستی کھلا دیتا تو کھا لیتی۔ ورنہ بھوکی ہی بیٹھی رہتی۔ بات چیت بھی بہت کم کرتی تھی۔ سارا دن گم صم خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ اسے نیند کی گولیاں دے کر سلاتے تھے۔ ورنہ وہ ساری رات باؤلوں کی طرح پھرتی رہتی دن کو بھی کمرہ کمرہ گھومتی رہتی۔ کپڑوں سمیت نہاتی اور پل پل ہاتھ دھوتی رہتی۔

ڈاکٹروں کا خیال تھا اسے کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اور اسے ذہنی اذیت پہنچائی جاتی رہی ہے۔ ویسے وہ پُرامید تھے کہ ان شاء اللہ جلد نارمل ہو جائے گی۔

بے جی نے اسے کوئی دسویں بار ہاتھ دھوتے دیکھا تو ان کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس لے آئیں

''ندا! میری بچی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟'' میں تیرے صدقے جاؤں، کیوں ہر وقت ہاتھ دھوتی رہتی ہو؟''

''یہ گندے ہیں۔۔۔'' وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کہاں گندے ہیں؟'' اتنے صاف اور پیارے تو ہیں۔'' انھوں نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔ ندا نے جلدی سے چھڑا لیے۔

''آپ نے کیوں چومے؟''

آپ نہیں جانتیں یہ ناپاک ہیں۔ دیکھیں

ان پر کتنی گندگی لگی ہوئی ہے، غور سے دیکھیں۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے آگے پھیلائے۔ انھوں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بمشکل بہنے سے روکا۔ ''یا اللہ کیا ہو گیا میری نازوں کی پالی کو۔

شرافت علی! اللہ تجھ سے پوچھے۔ میری بچی کی کیا حالت کر دی ہے تو نے؟

خدا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

شرافت کے نمبر پر امریکہ فون کرتے تھے، تو وہاں ٹیپ چل رہی ہوتی تھی۔ اعجاز تو امریکہ جانے پر تلا ہوا تھا۔ ''مردود نہ جانے کہاں دفع ہو گیا ہے۔ میں اس حرامزادے کو قتل کر دوں گا۔''

''بیٹا دھیرج سے کام لو۔ جب تک ندا اپنی حالت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی ہم شرافت کو کیسے مجرم سمجھ لیں۔'' بابا نے اعجاز کو سمجھایا۔

دو ہفتے کے بعد شرافت علی کی طرف سے ایک رجسٹرڈ لفافہ ملا۔ کھولا تو ندا کا طلاق نامہ تھا اور ایک مختصر خط بھی تھا۔

''آپ کی بیٹی ذہنی مریض ہے۔ میں کسی پاگل کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ تو شکر ہے زخم زیادہ گہرا نہیں تھا ورنہ آپ کی بیٹی امریکہ کی کسی جیل میں سزا بھگت رہی ہوتی میرا یہ احسان مانیں کہ پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے میں نے اسے پاکستان بھجوا دیا ہے۔''

ابا کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ان کا رنگ ہلدی جیسا زرد ہو رہا تھا۔ اگر بڑے بھی انھیں سہارا نہ دیتے تو وہ گر پڑتے۔

''یا الٰہی یہ میرے کن گناہوں کی سزا ہے؟'' مقدر میں یہ دن دیکھنا ہی لکھا تھا! آج نوازش علی شاہ کی پوتی پر یہ وقت بھی آنا تھا۔'' ان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

''وہ الو کا پٹھا حرامزادہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ میں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلاؤں گا۔ بلائیں اس کے باپ کو۔ ان کے نجیب الطرفین سیدزادے کے کرتوت بتائیں۔''

اعجاز آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''بیٹا تحمل سے کام لو شور مچا کر کیوں اپنی عزت اچھالنا چاہتے ہو۔''

''ابا جی جانے دیں! میں کچھ کہوں گا تو آپ کو برا لگے گا۔''

''اعجاز عقل سے کام لو۔ اب یہ کونسا موقع ہے طنز کے تیر چلانے کا۔''

بڑے بھیا کافی متحمل مزاج تھے۔

سارے گھر والے تندہی سے ندا کو زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے جت گئے۔ اللہ کا بڑا احسان تھا کہ وہ بڑی حد تک نارمل ہو چکی تھی۔ صرف اس وقت اپ سیٹ ہوتی جب امریکہ کے بارے میں کچھ پوچھا جاتا۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ جب

تک وہ خود کچھ نہ بتائے۔ بار بار پوچھ کر اسے پریشان مت کریں۔

''اس روز مدت کے بعد گھر میں خوشی کا ماحول تھا۔ اعجاز کو اللہ میاں نے بیٹے سے نوازا تھا۔ بچے کی رسم عقیقہ تھی سب بہن بھائی جمع تھے۔ اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ اعجاز نے ندا کو اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگالیا۔

''ندا کچھ بولا کرو نا۔''

''کیا بولوں؟۔''

''خوش رہا کرو۔''

''خوش تو ہوں۔''

اعجاز نے شاکی نظروں سے ندا کی طرف دیکھا۔

''فرح ثاقب کو ندا کی گود میں دے دو۔ دیکھو وہ تمھاری طرف دیکھ رہا ہے۔''

اعجاز نے ندا کو خوش کرنے کے لیے بچہ اس کی گود میں دینے کو کہا۔

جونہی فرح بچے کو لے کر ندا کی طرف بڑھی اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔

''نہیں نہیں اسے مت ڈالو میری گود میں وہ اسے بھی مار ڈالے گا۔''

''کون مار ڈالے گا؟'' بولو ندا کون مار ڈالے گا۔''

''وہ شرافت! اس نے میرے بچے کو مار دیا۔''

کیسے؟ ندا بتاؤ ناں۔''

''جازی! میرا بچہ اس نے مار دیا'' وہ اعجاز کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

شرافت علی اور اس کی چنڈال چوکڑی فلیٹ میں براجمان تھی۔ عورتیں اور مرد سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ مسلم غیر مسلم سب نے اپنی حیا بیچ کھائی تھی۔ شراب کے ساتھ نشے سے بھرے ہوئے سگریٹوں سے سارا فلیٹ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ان کی حرکتیں اور حلیے دیکھ کر ندا کو ابکائیاں آ رہی تھیں۔ رقص ابلیس جاری تھا۔ وہ چپکے سے جا کر اپنے بیڈ روم میں بند ہو گئی۔ وہ رو رو کر خدا سے شکوہ کناں تھی۔ ''میرے مولا! یہ میرے کن گناہوں کی سزا ہے؟'' مجھے اپنی پناہ میں رکھنا میرے معبود! ندا روئے جا رہی تھی شرافت مسلسل دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ندا پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ آخر اسے دروازہ کھولنا پڑا۔ کچھ دیر تو وہ سمجھ ہی نہیں سکی کہ ہو کیا رہا ہے۔ مارک نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ چیخ رہی تھی اور اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شرافت سمیت وہ سب قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی خاوند اتنا بے غیرت ہو سکتا ہے۔ اللہ جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی (حالانکہ وہ کافی کمزور ہو چکی تھی پھر اس کا پانچواں مہینہ بھی چل رہا تھا) اس نے اپنے دانت پوری

قوت سے مارک کے کندھے میں گاڑ دیئے۔ مارک نے درد سے بلبلا کر ندا کو چھوڑ دیا پھر تو ندا پر جیسے جنون سوار ہوگیا اس نے ناخنوں سے مارک کا منہ نوچ لیا۔ شراب سے بھری ہوئی بوتل اُٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ بہتا خون دیکھ کر سب کی چیخیں نکل گئیں۔ ندا نے شرافت پر بھی بوتل سے وار کیا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی دور جا گری شرافت نے دھکا دے کر ندا کو نیچے گرا دیا۔ لاتوں اور گھونسوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ ندا کی طاقت جواب دے چکی تھی وہ خاموشی سے پٹتی رہی۔ وہ اسے ٹھڈے مار رہا تھا اور غلیظ گالیاں بک رہا تھا۔

”حرامزادی کتیا! تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ بڑی پارسا بنی پھرتی ہے۔ تیری جرأت کہ تو میرے دوست پر ہاتھ اُٹھائے۔“ اور پھر ایک زوردار لات ندا کے پیٹ پر لگی۔ درد کی ایک شدید لہر اس کے پیٹ کے نچلے حصے اور کمر سے اُٹھی۔ اس کی دلخراش چیخوں سے زمین و آسمان ہل گئے اور وہ اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں پڑی تھی خالی دل اور خالی کوکھ کے ساتھ۔ اس حادثے کے ٹھیک ساتویں دن وہ پاکستان میں تھی۔

ابھی کل ہی کی بات ہے...... بالکل کل کی وہ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں سیڑھیوں پر بیٹھی دھوپ چھاؤں کا منظر دیکھ رہی تھی۔ موسلادھار بارش کے بعد بادل کہیں کہیں سے پھٹ گئے تھے اور سورج آنکھ مچولی کھیل رہا تھا مگر ساتھ ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ بڑا حسین منظر تھا۔ قوس قزح آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جا رہی تھی۔ وہ جب بھی دھنک کو دیکھتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ ان سارے رنگوں کے دوپٹے رنگوائے، لیکن مصیبت یہ تھی کہ دھنک کو رنگریز کے پاس نہیں لے جایا جا سکتا۔

ایسے خوبصورت موسم میں اعجاز نے گیٹ کھولا اور کسی سے باتیں کرتا ہوا اندر چلا آیا۔ آنے والے پر ندا کی نظر پڑی تو اس نے تیزی سے دوپٹے سے اپنا سر ڈھانپ لیا اور قدرے رُخ موڑ لیا۔ اس موقع پر وہ اُٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔

”یہ جازی بھی عجیب ہے! نہ جانے کس کو منہ اُٹھائے لیے چلا آ رہا ہے۔“

آنے والا برآمدے کے موزیک کے فرش پر پاؤں دھرتا بوگن ویلیا کی بیلوں سے اُلجھتا (جو برآمدے کے ستونوں سے لپٹی ہوئی تھی) جازی کے کمرے کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے میں گم ہوگیا۔

جازی کو دوست بنانے کا خبط تھا۔ گھر والے اس کے نت نئے دوستوں سے عاجز تھے۔

اس کے دوستوں میں ہر قسم کے نمونے پائے جاتے تھے۔ نیا نمونہ پرکاش نیپالی تھا۔ دیکھنے میں وہ سوات کا پٹھان لگتا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ انگریز اور ماں بدھ مذہب سے تھی۔

جازی دوست بنانے میں بہت جلد باز تھا۔ بقول:

"بابا جان کے اسے کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں ہے۔" دوستوں پر جان دیتا انھیں گاڑیوں میں لیے پھرتا۔ گھر میں ان کے کھانے کیے جا رہے ہیں۔ ہوٹلنگ ہو رہی ہے۔ ان کا گھر کا کوئی مسئلہ ہے تو جازی صاحب حاضر۔ چار پانچ ہزار تک ادھار تو معمولی بات تھی۔ جو کبھی واپس نہیں ملتا تھا۔

اچانک کوئی دوست منظر سے غائب ہو جاتا تو اعجاز دوست کی مطلب پرستی کا گلہ کرتا اور دکھ ہوتا۔ البتہ پرکاش شاید کسی اور مٹی سے بنا تھا۔ فورتھ ایئر سے ہاؤس جاب تک ان کی دوستی کو تین سال ہو چکے تھے۔

پرکاش سے ندا کی دوسری ملاقات جنرل ہسپتال کے سرجیکل وارڈ میں ہوئی۔ وہ بیڈ پر پٹیوں میں جکڑا اسپیس مین بنا پڑا تھا۔ ندا کا آخری پیریڈ دو بجے ختم ہوتا تھا اور اب چار بج رہے تھے۔ اور جازی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ غصے کے مارے ندا کا خون کھول رہا تھا۔

"سدا کا لاپرواہ! مل گئے ہوں گے کوئی دوست خدائی فوجدار کو۔ آج تو میں نے بابا جانی سے اس کی شکایت نہ لگائی تو میرا نام ندا نہیں۔"

وہ جب بھی کبھی لیٹ ہوتا تو گھر والوں کے استفسار پر ہمیشہ یہی کہتا میں تو ٹائم پر پہنچ گیا تھا ندا کی کلاس دیر سے ختم ہوئی۔" ندا مسکرا کر بھائی کا بھرم رکھ لیتی، مگر آج تو حد ہو گئی تھی۔ وہ اکتا کر دوبارہ گھاس پر بیٹھ گئی۔

"ارے سوری میری بہنا! آج تو بہت دیر ہو گئی۔"

وہ بولی کچھ نہیں اور گاڑی کی طرف چل پڑی۔

"ندیا!" وہ جب زیادہ لاڈ جتاتا تو اسے ندیا پکارتا۔

ندا نے پھر بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

"پلیز خفا مت ہو۔ وہ پرکاش ہے ناں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہسپتال میں تھا۔ تم تو جانتی ہو بے چارہ پردیسی ہے۔" ندا نے اسے گھور کر دیکھا "سچ کہہ رہے ہو۔"

"تمھاری قسم! بلکہ اگر تم محسوس نہ کرو تو راستے میں کچھ پھل وغیرہ خرید کر اسے دے آؤں۔"

ندا خاموش رہی۔ اس کا مطلب تھا کہ منظوری مل گئی ہے۔ جازی گاڑی سے اُترنے لگا تو جانے کیا سوچ کر بولا۔ "تم بھی آ جاؤ، کوئی ہرج نہیں۔" وہ کالی چادر کی بکل مار کر اس کے پیچھے چل پڑی۔

کچھ دیر وہ خاموشی سے کھڑی رہی پھر باہر

نکل آئی اور آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔
جب اس سے تیسری ملاقات ہوئی تو وہ شام کا وقت تھا۔ چڑیاں بسیرے کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ وہ برآمدے میں اپنی مخصوص سیڑھیوں پر بیٹھی ڈوبتے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ سونے کا تھال دور افق میں ڈوب چکا تھا۔ بس اس کا ذرا سا شنگرفی کنارا سفیدے کے درخت کے پیچھے نظر آ رہا تھا۔ ایسے میں وہ اس کے پاس سے گزرا۔ ''کالا دوپٹہ مت اوڑھا کیجیے۔'' کسی کے دل کی دھڑکن نہ رک جائے۔'' وہ حیرت سے اس نیپالی کوستون کے پیچھے گم ہوتا دیکھتی رہی۔
جازی ان دنوں بہت دکھی تھا۔ اس کا ہاؤس جاب اب ختم ہونے والا تھا، اور ایک دو ماہ تک پرکاش واپس جانے والا تھا۔
رمضان کا چاند دوہری خوشیاں لے کر آیا تھا بابا جان کے باہر والے کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ادھر مسجد سے مؤذن کی آواز آئی اور پرکاش کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس کا نام بھی محمد اسلام تجویز ہوا۔ اسلام کو اتنے پھولوں سے لادا گیا کہ اس کا چہرہ بمشکل نظر آ رہا تھا۔ قبول اسلام سے پہلے بابا نے اسے اچھا خاصا لیکچر دیا تھا۔
''دیکھو بیٹا! ایک بار پھر سوچ لو۔ تم نے بڑا کٹھن راستہ چنا ہے۔ تمھارے والدین، بہن بھائی کیا ان سب کو چھوڑ سکو گے۔؟''
''کیا تم کسی وقتی جذبے کے تحت تو مسلمان نہیں ہو رہے؟''
''میں نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا ہے۔ پورے تین سال گہری نظر سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ اور میں اس کی حقانیت کا قائل ہو گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے ثابت قدم رکھے۔ میں اکلوتی اولاد ہوں۔ میرے والد میری ماں کو چھوڑ چکے ہیں۔ پچھلے سال میں والدہ سے ملنے گیا تھا تو میں نے انھیں اپنے اندر ہونے والی تبدیلی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔''
''آج سے تم ہمارے بیٹے ہو۔ تمھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو۔ کوئی ضرورت ہو۔ ہمیں بتاؤ۔'' بابا جان نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔
سارا رمضان اعجاز کے کمرے سے ایسی خوبصورت قرأت کی آواز آتی کہ سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔ اسلام خاص طور پر سورۃ رحمٰن ایسی خوش الحانی سے پڑھتا تھا کہ بابا جان بھی آبدیدہ ہو جاتے تھے۔
پرکاش کے قبول اسلام پر سب سے زیادہ اعجاز خوش تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس خوشی میں کیا کر ڈالے۔ اس کی خوشی تو سب کو نظر آ رہی تھی لیکن ندا کی آنکھوں میں جو چور بتیاں جل اٹھی تھیں وہ شاید کسی کو نظر نہیں آئی تھیں۔
اس روز گویا گھر میں آتش فشاں پھٹ پڑا۔

جس روز اعجاز نے اسلام اور ندا کے رشتے کی بات کی۔ بڑے بھیا اور بابا جان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

"تمھیں ہمت کیسے ہوئی ایسی بات زبان پر لانے کی۔ تم نہیں جانتے تم کسی خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ گاؤں سے آکر شہر میں بس جانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنا شجرہ نصب ہی بھلا دیں۔ سید نوازش علی کی پوتی کسی نومسلم سے بیاہی جائے۔ ہمارے خون میں یہ بے کیسے لگ سکتا ہے؟

"بابا جانی! وہ کتنا نیک اور سعادت مند ہے۔ اس میں کیا عیب ہے؟

اس نے ہمارا دین قبول کیا ہے۔ اسے تو اپنے خاندان میں شامل کرنا عین ثواب ہے۔ یہ اللہ کی قربت کا باعث ہوگا۔"

"بکواس بند کرو، تم اپنا لیکچر اپنے پاس رکھو۔ چار حرف پڑھ کر تمھارا دماغ خراب ہوگیا ہے"

اسلام نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ بڑی عاجزی سے اعجاز سے بات کی تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر اعجاز کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں گھٹنوں کو اپنے کلاوے میں لے لیا اور بولا۔ "اعجاز میں ندا کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔

ایک لمحے کے لیے اعجاز سن سا ہوگیا۔

اسلام نے ڈرتے ڈرتے اعجاز کی طرف دیکھا اور بت کی طرح ساکت تھا۔

"میں جانتا تھا تم ضرور ناراض ہو جاؤ گے۔ تم مجھے ڈانٹ لو تھپڑ مار لو مگر اس طرح خاموش مت رہو۔ ایک بات میں تمھیں پورے یقین اور ایمان کے ساتھ کہتا ہوں۔ تمھاری بہن فرشتوں کی طرح معصوم ہے وہ اس سارے واقعے سے قطعی لاعلم ہے۔ اس میں اس کا ذرا سی بھی دخل نہیں۔ ہم نے تو شاید ہی کبھی بات کی ہو۔ میری بات کا یقین کرنا میرے دوست۔" اس نے اعجاز کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے جو آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

اس کے بعد ندا اور گھر والوں نے دوبارہ کبھی اسلام کی شکل نہیں دیکھی۔ اللہ جانے وہ کن راہوں میں گم ہوگیا تھا۔ پھر کبھی گھر میں کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ یا تو ندا نے بھی اس کو کبھی نہیں کیا تھا۔ بس صرف اس نے کالا دوپٹا اوڑھنا چھوڑ دیا تھا۔

سیدہ ندا بنت سجاد علی شاہ کی بارات ایسی دھوم دھام سے آئی کہ لوگ مدتوں نہ بھلا پائے ہوں گے۔ بڑے بھیا اور بابا جان کا پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہا تھا۔ گو ان کا اپنا خاندان بھی عزت و وقار اور جاہ و حشم میں کچھ کم نہیں تھا۔ لیکن ان کے داماد کے خاندان کی بات ہی کیا تھی۔ چکوال کے مشہور گدی نشین کا اکلوتا پوتا، نجیب الطرفین، خوش شکل پڑھا لکھا، امریکہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز۔ انھوں نے ایسے ہی داماد کی

تمنا کی تھی۔ سارا خاندان ندا کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ بھلا اتنی ساری خوشیاں کس کو ملتی ہیں؟ بقول بے جی کے ”اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ میری ندا کا سا تو مقدر کسی کسی کو ملتا ہے۔“

شرافت علی شادی کے لیے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس نے جلدی ہی ندا کو بلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ شادی کے اڑھائی ماہ بعد وہ طیارے میں اڑی چلی جا رہی تھی۔ اپنے وطن سے اپنے پیاروں سے دور ایک نئے رشتے کی ڈور سے بندھی۔ ندا کے دل میں اپنوں سے بچھڑنے کا غم بھی تھا اور اپنے گھر جانے کی خوشی بھی تھی۔

جہاز کے لینڈ کرنے اور لاؤنج سے باہر نکلنے تک وہ وسوسوں اور خدشوں میں گھری رہی۔ زندگی میں اکیلے سفر کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اور وہ بھی اتنے دور دراز ملک کا۔ اللہ کرے شرافت وقت پر پہنچ جائے ورنہ میں اس اجنبی دیس میں کیا کروں گی۔

شرافت کی شکل دیکھتے ہی اس کی جان میں جان آئی۔ ایئرپورٹ سے گھر پہنچنے تک وہ اپنے سارے وسوسے اور خدشے ذہن سے جھٹک کر شانت ہو چکی تھی۔ فلیٹ کا دروازہ کھول کر جونہی اندر داخل ہوئے ایک نیم عریاں گوری کو کندھے پر تھیلا لٹکائے دروازے سے باہر نکلتے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

”یہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ ان کا کچھ سامان پڑا تھا وہ لینے آئی ہوگی۔“ شرافت نے اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر وضاحت کی۔ ابھی شاید ندا کو مزید وضاحت کی ضرورت تھی۔

میرا دوست اور میں کافی عرصہ اکٹھے رہے ہیں۔ میرے فلیٹ کی دوسری چابی اس کے پاس تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کے فلیٹ میں شفٹ کر گیا تھا۔ تم نہا کر فریش ہو جاؤ میں اتنے میں ناشتہ لگاتا ہوں۔“

ندا نے خوشگوار حیرت سے شرافت کو دیکھا۔ پاکستان میں اور خاص طور پر پرانی اقدار والے گھروں میں اس چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مرد اس طرح ناشتہ بنا کر بیوی کو پیش کرے۔

شرافت ندا کو اچھا ہی لگا تھا۔ پر اس کی شخصیت میں کوئی عجیب سی بات تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔ رات کو دیر سے آتا اکثر کھانا کھا کر آتا پوچھنے پر جواب دیتا۔ ”دفتر میں لیٹ ہو گیا تھا تو دوستوں کے ساتھ کھا لیا۔“ زیادہ بات چیت بھی نہیں کرتا تھا۔ گھر سے فون آتے رہتے تھے ہر کوئی شرافت کے بارے میں پوچھتا تھا خاص طور پر بے جی ”شرافت تمہارا خیال رکھتا ہے۔ مزاج کیسا ہے۔“

”اچھے ہیں بے جی۔“

”ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ ابھی وقت ہی

کتنا ہوا ہے۔ گھبرانا نہیں۔ ایڈجسٹمنٹ میں تھوڑا وقت لگتا ہے۔ میری بیٹی بڑی سمجھ دار ہے۔"
شرافت کو اپنا مصنوعی لبادہ اتار پھینکنے میں زیادہ دن نہیں لگے۔ خدا جانے ایک ڈیڑھ ماہ دکھاوا کیسے کر پایا تھا۔ اجلے اجلے شرافت کا جو بھیانک روپ اندر سے نکلا تھا۔ ندا کے لیے وہ کسی الیکٹرک شاک سے کم نہیں تھا۔
"ندا! آج رات میرے دوست ڈیوڈ کے ہاں پارٹی ہے۔ تیار رہنا! وہ ہماری شادی کی خوشی میں پارٹی دے رہا ہے۔"
ندا بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ اس نے ہلکے سے کام والا فیروزی کرتہ دوپٹہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنا اور بالوں کا جوڑا بنا لیا۔
"اوہ مائی گارڈ تم یہ شامیانہ پہن کر پارٹی میں جاؤ گی۔" شرافت نے اسے دیکھ کر آنکھیں پھاڑیں۔
ندا کا دل ٹوٹ سا گیا۔ وہ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر خود ہی سراہتی رہی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق تو وہ اس لباس میں بہت حسین لگ رہی تھی۔
"اتنے اچھے تو ہیں اور ہم تو ابھی دولہا دلہن ہی ہیں ناں۔" وہ شرما کر بولی۔
"ارے چھوڑو یہ دقیانوسی باتیں۔ یہاں ایسے لباس میں کارٹون لگو گی اور میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی کارٹون لگے۔"
"میرے پاس تو اسی قسم کے جوڑے ہیں یا پھر سادہ سے ہیں۔ میں کوئی سادہ شلوار کرتہ پہن لیتی ہوں۔" وہ بددلی سے بولی۔
"تمہارے پاس کوئی ساڑھی نہیں ہے؟"
وہ ساڑھی پہن کر نکلی تو شرافت نے زوردار سیٹی ماری۔
"واؤ! زبردست بڑی سیکسی لگ رہی ہو۔ میرے دوست دیکھیں گے تو پاگل ہو جائیں گے۔" ندا کو بہت بُرا لگا وہ تو شرافت کے لیے تیار ہوئی تھی "یہ کم بخت دوستوں کا کیا ذکر۔"
ندا کو دیکھ کر سب نے تعریفی سیٹیاں بجائیں "ہاؤ سویٹ! بیوٹی فل! پرنسس!"
اس ماحول کو دیکھ کر مذہبی گھرانے میں پلی بڑھی ندا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ان کے ہاں تو باپ بھائیوں کے سامنے بھی ننگے سر سامنے آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور یہاں خواتین نے برائے نام ہی لباس پہن رکھے تھے۔ شراب کے دور چل رہے تھے کوئی کسی کے شانوں پر اور کوئی کسی کی باہوں میں جھول رہا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کون کس کی بیوی ہے اور کس کا شوہر ہے۔ شرافت مکمل طور پر اس ماحول کا حصہ لگ رہا تھا۔ ندا ایسے گم صم بیٹھی تھی جیسے میلے میں کوئی بچہ گم ہو جائے۔ اس کے دوستوں نے ندا کو بھی اس بیہودگی میں شامل کرنا چاہا مگر اس کی ناگواری دیکھتے ہوئے

شرافت نے منع کر دیا۔

''ابھی نئی نئی ہے۔ کچھ ہی عرصے میں اپنے رنگ میں رنگی جائے گی۔ آفٹر آل میں اس کا مجازی خدا ہوں۔ اسے میرا حکم تو ماننا پڑے گا۔'' شرافت نے دوستوں کو آنکھ مار کر بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

''لعنت ہو تم سب پر۔ میں کیوں اس بے حیائی کے رنگ میں رنگی جاؤں گی۔'' وہ دل میں چیخی۔

شرافت کے سونے کے بعد وہ باتھ روم میں گھسی زار و قطار روتی رہی۔

''یہی ہے وہ خوبصورت زندگی کے خواب وہ آنکھوں میں بسا کر آئی تھی۔ یہ تھا وہ پھولوں بھرا راستہ جس پر چلنے کی تمنا کی تھی اور یہ تھا بابا کا قابل فخر نجیب الطرفین سید زادہ جس کی خاندانی شرافت اور نجابت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔

''یہ میں کس اندھی کھائی میں آ گری ہوں۔ جس میں سے نکلنے کا خدا جانے کبھی راستہ مل سکے گا یا نہیں۔ یا یہیں دم گھٹ کر مر جاؤں گی۔''

اس نے شرافت کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس بگڑے سید زادے کو راہ راست پر لے آئے گی مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔

''جانم کیا دقیانوسی باتیں کرتی ہو۔ یہاں سب کی اپنی اپنی زندگی ہے تم بھی اپنی زندگی انجوائے کرو۔ میں تمھیں روکتا نہیں۔ چاہو تو تم بھی مارک کے ساتھ چلی جایا کرو۔ وہ تو تمھارا دیوانہ ہے۔ لو یہ ماری جوآنا کا ایک کش لے کر دیکھو پھر دیکھو کن جہانوں کی سیر ہوتی ہے۔'' شرافت نے سارا دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے اسے بازو سے گھسیٹا۔

''چھوڑو میرا ہاتھ تم اس حد تک گر چکے ہو، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تم ذلیل اور بے غیرت انسان ہو۔'' آنسوؤں نے اس کے گلے میں پھندا لگا دیا۔

شرافت کا جھاگ اُتر گیا تھا۔ اکثر رات کو نشے میں دھت کسی گوری کے ساتھ آتا اور اسے بیڈ روم خالی کرنے حکم صادر کرتا۔ وہ ساری رات جائے نماز پر روتے اور گڑگڑاتے ہوئے گزار دیتی۔ ''میرے مالک یہ میرے کن گناہوں کی سزا ہے۔ میرے اللہ مجھے کس کی بد دعا لگی ہے۔ میں نے تو کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔'' روتے روتے سجدے والی جگہ بھیگ جاتی۔

''کیا کروں؟ جازی کو فون کروں۔ مگر اس نے شرافت کو کچھ کہہ دیا اور اس نے مجھے طلاق دے دی۔ میرے بابا تو صدمے سے مر جائیں گے۔

یا اللہ مجھے کوئی راستہ دکھا۔''

ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس کی زندگی میں روشنی کی ایک کرن چمکی وہ ماں بننے والی

تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شرافت اب یقیناً راہ راست پر آ جائے گا۔ شرافت کو پتہ چلا تو وہ خوش ہونے کے بجائے بہت بگڑا۔ بولا ندا یہ کیا؟ مجھے ابھی بچہ نہیں چاہیے۔ چلو میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔ ہم اس سے آسانی سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ ہمارا پہلا بچہ ہے۔ اور آپ ایسا سوچ رہے ہیں۔ نہیں! میں یہ گناہ ہرگز نہیں کر سکتی۔''

'پھر اکیلے ہی بھگتنا۔''

جس طرح اس نے پریگنینسی کا وقت گزارا یہ وہی جانتی تھی، لیکن جو خدا کو منظور تھا۔ اسی بہانے اس کی جان چھٹی اس نرگ سے۔

ندا پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن مکمل طور پر نارمل نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں اسے ایک اور وہم ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ لگائے رکھتی۔

''میں نے شاید کسی کا دل دکھایا ہو گا۔ انجانے میں کسی کو دکھ دیا ہو گا۔ مجھے کسی کی بددعا لگی ہے۔ جبھی تو میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوا۔ میرا بچہ بھی نہ رہا۔ اگر وہ ہوتا تو کم از کم میرے جینے کا آسرا ہوتا۔''

بڑی بھابی کی امی کسی بزرگ کی کرامت کی شہرت سن کر آئی تھیں۔

''سنا ہے وہ کسی سے ایک پیسہ نہیں لیتے، کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ نہ کوئی دم نہ تعویذ بس پڑھنے کے لیے قرآنی آیات بتاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ ان کی دعا میں بڑا اثر ہے۔ لوگوں کے بگڑے کام سنور جاتے ہیں۔ بہت دنیا جاتی ہے ان کے پاس۔ میری پڑوسن بتا رہی تھی۔ وہ لوگوں کو آنے سے منع کرتے ہیں۔'' وہ کہتے ہیں ''میں عام سا گنہگار بندہ ہوں۔ میں آپ کا کیا سنواروں گا میں تو خود اپنی کھوج میں بھٹک رہا ہوں۔'' پر لوگ پھر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔''

بے جی ندا کو لے جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئیں۔

بابا کو پتہ چلا تو انھوں نے بھی منع کیا۔ بڑے بھیا نے دور کے سفر سے بے جی کو ڈرانا چاہا، مگر وہ بولیں۔ ''میری بچی کو سکون مل جائے۔ وہ نارمل ہو جائے چاہے مجھے جتنی بھی دور جانا پڑے۔'' بڑی بھابی اور بے جی ڈرائیور کے ساتھ ندا کو لے کر چل پڑیں۔

وہاں تو ایک میلے کا سماں تھا۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں کے بیچ لوگ چلے جا رہے تھے۔ بے جی اور بھابی پوری طرح عقیدت میں ڈوب گئیں۔ بے جی نے ندا کو دیکھا وہ نہ جانے کس سوچ میں گم تھی۔

''یا مولا! یا پیر دستگیر! میری بچی اس ولی بزرگ کے در سے خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ یا میرے مولا! اسے ذہنی اور دلی سکون عطا فرما۔''

پہاڑ کے دامن میں مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے دو کمرے تھے سامنے برآمدہ تھا۔ سامنے والا کمرے اور برآمدے میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، جوان سب اپنی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی ڈور میں بندھے۔ ایک تسلی، ایک دلاسے اور دعا کے منتظر تھے۔ ہر کوئی اپنی باری پر اندر جاتا اور تھوڑی دیر کے بعد چہرے پر اُمید کا اُجالا لیے باہر چلا آتا۔

”ندا اٹھو، بھابی نے غائب دماغ بیٹھی ندا کو شانہ ہلایا۔

”کہاں جاؤں؟ مجھے تو کہیں نہیں جانا۔“

”پاگل نہ ہو اتنی مشکل سے تو یہاں پہنچے ہیں۔ جاؤ شاباش! بابا جی کو اپنی ساری کیفیت بتاؤ۔ ان شاء اللہ ان کی دعا سے تمھارے دل کو سکون مل جائے گا۔

”بھابی تم بھی چلو! اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”پگلی! اللہ والوں سے کیا ڈرنا۔ تم اکیلے جاؤ اور ساری پریشانیاں دل کھول کر بتاؤ۔“

اس نے سفید چادر کی بکل میں اپنے آپ کو اچھی طرح چھپا لیا۔ اور ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔ اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے وہ جس کے ساتھ اس کا کوئی ناطہ نہیں تھا۔ وہ اسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ کالی داڑھی کے ہالے میں اس کا نورانی چہرہ دمک رہا تھا۔ گھونگھریالے بال سفید ٹوپی میں چھپے ہوئے تھے اور چراغوں کی مانند لو دیتی آنکھیں بند تھیں اور سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی سینے کو چھو رہی تھی۔

ندا کی تو جیسے قوت گویائی ختم ہو گئی۔

وہ آگے جھکی اور اس چٹائی کا کونا پکڑ لیا، جس پر وہ کسی سنگ تراش کے مجسمے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

”مجھے بھی اپنے جیسا سکون دے دو، بس میں اور کچھ نہیں چاہتی۔“

وہ بے آواز بولی آنسوؤں کی جھڑی سے اس کی چادر کا کونا بھیگ گیا۔

”کاش میں ان مقدس ہاتھوں کو ایک دفعہ پکڑ کر آنکھوں سے لگا سکوں۔“ کمرے کی خاموشی میں اس کی سسکیوں کی آواز گونجی تو بت سے آواز آئی۔

”بی بی! مت روئیں۔ صبر سے کام لیں۔ اللہ تعالیٰ کرم کرے گا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن۔ کی ایک تسبیح سونے سے پہلے کیا کریں اور اُٹھتے بیٹھتے دل میں درود شریف اور یا رحمٰن یا رحیم کا ورد کیا کریں۔“

وہ خاموشی سے اُٹھی اور چلی آئی کون جانے سکون کی دولت لے کر یا بے سکون ہو کر۔

☆☆☆☆☆

لاج

بملا دیوی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ، نہ تھا۔ اکلوتا بیٹا آخر کار شادی پر راضی ہو گیا تھا۔ بملا نے بیاہ سے سات دن پہلے تک گھر میں ڈھولکی رکھوا دی تھی، بہن تو کوئی تھی نہیں، سو رشتہ دار اور پڑوس کی لڑکیاں، بالیاں شام کے بعد آ جاتیں اور خوب جی بھر کر ڈھولک پیٹیں۔ بملا انھیں کچھ، کھلائے پلائے بغیر نہ بھیجتی۔ دیکھنے میں سیدھا رتو خوب بانکا سجیلا تھا۔ بملا اپنی مَن پسند بہو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ برابر والے گاؤں کی لابی سی نوتن۔ بملا نے دیکھتے ہی اس کے غریب والدین کے سامنے روپے اور گہنے رکھے تو وہ اس کے پاؤں پڑ گئے۔ نوتن کا بہنوں میں دوسرا نمبر تھا۔ باقی چار بہنیں اور تھیں۔ سو بات طے ہو گئی۔

سدھارتو کے پاس کچھ زمینیں تھیں۔ پکّا گھر تھا۔ چند ایک جانور بھی تھے۔ خوشحالی تھی۔ نوتن کا باپ بملا کے آگے بچھ بچھ گیا۔

یوں دنوں میں ہی نوتن سدھارتو کی دلہن بن کر آ گئی۔ اصلی، نقلی پھولوں سے سجی، سجری سولہ شنگھار کیے وہ اپنے پتی کی منتظر تھی کہ وہ آ گیا۔ اسے دیکھا اور سر درد کا بہانہ کر کے سونے لگا کروٹ بدلی۔ نوتن نے ایسا سجیلا مرد کب دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی فدا ہو گئی تھی اور اس کے قریب ہو کر اس کا سر دبانے لگی۔ مگر سدھارتو، تو کسی بے حس بت کی مانند پڑا تھا۔ اس پر کچھ اثر نہ ہو رہا تھا۔ نہ اس رات کا، نہ دلہن کے وجود کی خوشبوؤں کا۔ نہ جذبوں کی کھنک کا۔ آخر کار تھک ہار کر نوتن بھی اس کی طبیعت کے خراب ہونے کا سمجھ کر سو رہی۔

صبح ہوئی تو وہ معذرت کرنے لگا۔ تو، نوتن نے اس کی طبیعت پوچھی بوجھل سی ہے۔ کاموں کی وجہ سے تھک گیا تھا۔

بملا۔ بہو پر صدقے واری جاتی۔ نوتن غربت کاٹ کر آئی تھی ابھی اس کے بعد چار کنواری بہنیں باقی تھیں۔ سو اسے برداشت کرنا تھا۔ مزیدار روٹی وقت پر مل جاتی تھی۔ فروٹ، صاف پانی میسر تھا۔ کیا ہوا جو سدھارتو نے اسے بیوی کا درجہ نہ دیا تھا۔ وہ زرق برق کپڑے معاشی استحکام سے خوش تھی۔ بملا الگ اس کا خیال رکھتی تھی۔ اسے بس ایک ہی خواہش تھی کہ جلدی سے دادی بن جائے۔

نوتن کو کئی گھرانے، بھوکی نظریں ستائش سے دیکھتے۔ اس کے اپنے گھر والوں کی آنکھیں بھی اس کی خوشحالی پر چمک اُٹھی تھیں۔ ماں باپ، خوش تھے، مگر نوتن، جس کی راتیں، کروٹیں بدلتے گزرتی تھیں۔ اپنے دل کا

فصیحہ آصف خان

حال کس سے بیان کرتی۔ ہر رات سدھارتو پاس ہوتا، مگر اس سے بہت دوری پر۔ دو ماہ شادی کو گزر گئے تھے۔ اس نے اچھے طریقے سے گھر، گھرستی سنبھال لی تھی۔

بملا اسے ہار، سنگھار کیے رہنے کا بولتی رہتی۔ وہ خوب تیار رہتی مگر سدھارتو کے اندر کوئی جذبہ بیدار نہ ہوتا تھا۔

دن چڑھے وہ کام پر نکل جاتا۔ شام گئے لوٹتا تھا۔ تین ماہ گزر گئے تھے۔ بملا کو شدت سے انتظار تھا کہ نوتن کوئی خوشی کی خبر سنائے۔ نوتن شرما جاتی اور بھرم کی چادر اپنے گرد کس کے لپیٹ لیتی، مگر دماغ میں چکر چلتے رہتے۔ کچھ عرصے بعد بملا دبے دبے الفاظ میں اس سے پوچھنے لگی۔ نوتن سر جھکا کر رہ گئی۔ بملا کے کان ترس رہے تھے اس نے ساس پہ نظریں جما دیں کہ ابھی انتظار کرے۔ سدھارتو سے اس موضوع پر بات فضول تھی۔

شادی کے ٹھیک 7 ماہ کے بعد___

ایک صبح نوتن کے مرنے کی خبر لوگوں پر حیرت بن کر ٹوٹی۔ رات کے کسی پہر وہ مر گئی۔ سدھارتو ڈھاریں مار کے رو رہا تھا۔ ہائے رام_ میرے بچے کا تو گھر ہی اُجڑ گیا۔ میں پوتا پوتی کو ترس گئی۔ بملا بین کر رہی تھی نوتن کی جوانمرگی پر سب ہی افسردہ تھے۔ رات کے کسی لمحے اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی۔ ذہنی دباؤ کے سبب، ڈاکٹر، حکیم نے اپنا تجربہ بتایا۔

سدھارتو چند دن اداس رہا، پھر زندگی رواں، دواں ہوگئی۔ بملا کے اندر کی خواہش اور زور پکڑنے لگی تھی۔ پوتا یا پوتی۔ کوئی تو وارث ہو۔ وہ اسی آرزو کے گرد گھوم رہی تھی۔ نوتن کے دیہانت کے دو ماہ کے بعد ہی اس نے سدھارتو کے لیے رشتے دیکھنے شروع کر دیے۔ سدھارتو مسلسل انکار کر رہا تھا کہ اسے نوتن سے بہت محبت تھی۔ اب وہ بیاہ نہیں رچائے گا، مگر بملا نے اسے جھڑک کر کہہ دیا کہ وہ فوراً سے پیشتر اس کا بیاہ کرائے گی۔ تاکہ اس کے سونے آنگن میں بھی قلکاریاں گونجیں۔ وارث پیدا ہو۔ وہ تو اکلوتا تھا۔ مگر اس کے ڈھیروں بچے ہوں۔ سدھارتو کا باپ اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی فوت ہو گیا تھا۔ یوں بملا کے ڈھیروں بچوں کی خواہش اب سدھارتو سے مشروط تھی۔

جلد ہی بملا کی مراد بھر آئی۔ جب موسی پریما نے اسے لڑکی دکھائی۔ شینہ رنائی کی بیٹی۔ سدھارتو بمشکل راضی ہوا۔ غریب گھرانے کی تھی۔ شینہ رنائی بھی فاقوں کا مارا گھرانہ لیے بیٹھا تھا۔ پہلے تو حیل و حجت کی پھر مان گیا۔ بیٹی کے لیے اچھا، اونچا گھرانہ مل رہا تھا۔ اس کے گھر تو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے تھے۔ ایسے میں سب کے سمجھانے، بجھانے پر وہ مان گیا۔ سوچٹ منگنی، پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا۔ کامنی بچے دل سے سدھارتو کی زندگی میں داخل ہوگئی۔ سدھارتو۔ خوش تھا تو بملا بے حد خوش تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی

ٹھکانہ، نہ تھا۔ کہ جیسے آج شادی ہوئی تو کل بچہ اس کی گود میں آ کے ہمکنے لگے گا۔ اسے بس اسی دن کا انتظار تھا۔

سیج پر بیٹھی کامنی اپنے لباس اور زیورات میں نہال تھی۔ لذیذ کھانا کھا کر اب مستی سے انگڑائی لینے کو من کر رہا تھا۔ مگر، سدھارتو آیا اور سر درد کا بہانہ کر کے اسے سے معذرت کرنے لگا۔

اور کامنی کو اپنے پتی کی طبیعت کی خرابی گوارا نہ ہوئی، تو اسے آرام کرنے کا کہہ کر خود لباس اور زیورات تبدیل کرنے اس کے قدموں کی طرف آ گئی اور اس کے پیروں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔ دیو داسی بن رات بتادی۔

سدھارتو سوتا جاگتا رہا۔ کامنی کی بھی آنکھ لگ گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی، نئی نویلی دلہن کو سدھارتو نے اپنے ساتھ لگا کر خوب پیار کیا کامنی کا دل بہل گیا۔ وہ ایک خاموش طبع اور ڈرپوک لڑکی تھی۔ چند دن بعد ہی اس نے گھر کے سارے کام اپنے ذمے لے لیے۔ سدھارتو کے کپڑوں، جوتوں، کھانا غرضیکہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ بملا کی خدمت کر کے اس کا دل جیت لیا تھا۔ ہر آئے گئے سے اخلاق سے ملتی۔

کرمو ماچھی کے لیے الگ کھانا نکال کر رکھتی، وہ برسوں سے اس گھر میں پینے کا پانی دینے آتا تھا، اب بزرگ ہو گیا تھا۔ بملا بھی اس کا خیال رکھتی تھی۔ اب کامنی نے یہ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

وہ کامنی کے سامنے پرارتھنا کرتا کہ رام اس کی گود بھر دے۔ تب بملا کہتی۔ کرمو تمھارا منہ گھی شکر سے بھر دوں گی۔ کرمو اسے تسلیاں دیتا۔ کامنی نے گھر کے ایک کونے مویشی سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ وہ صبح ہی صبح ان میں سے کچھ نہ کچھ توڑ لاتی۔ کبھی ہرا دھنیا، بھنڈیاں، کریلے وغیرہ۔ بملا اس کے شوق سے خوش تھی۔

شادی کے تین ماہ بعد بھی وہ ان چھوئی کلی کی طرح تھی۔ سدھارتو رات گھر آتا، کھانا کھاتا، کمرے میں آ کر اسے گلے لگاتا۔ دو چار بوسے لیتا، کامنی شرم سے دوہری ہو جاتی۔ سدھارتو اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکتا۔ اور سونے کی تیاری کرنے لگتا۔ کامنی الجھنوں میں تھی۔ ایک رات گلوگیر آواز میں بولی۔

میں اچھی نا ہی لگی آپ کو، وہ سر جھکائے حیا آلود لہجے میں بولی تو سدھارتو کے کان کھڑے ہو گئے۔ نہ۔ نہ۔ تم تو دیوی ہو۔ پارسا ہو۔ میرے دل کی ملکہ ہو۔ سدھارتو اسے تسلیوں کے جام پلا کر سلا دیتا۔ اور سو جاتا۔ سرد آہیں بھر کر

چار ماہ گزر گئے۔ بملا کے کان مسلسل ترسے ہوئے تھے۔ اس روز صبح ہی صبح کامنی سبزی توڑنے صحن کے پار آ گئی۔ بھنڈیاں توڑ رہی تھی کہ سانپ نے پھن نکالا اور کامنی کے پاؤں کے اندر اپنا زہریلا ڈنک اتار دیا۔

کامنی وہیں ڈھیر ہوگئی۔ کافی دیر تک جب وہ نہ آئی تو بملا اسے پکارتی وہاں آئی تو کامنی کا بے جان وجود، اور آسمان پر ٹکی بے نور آنکھیں، اس کی منتظر تھیں۔ وہ چیخ و پکار کر اسے ہلانے جلانے لگی۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ کامنی سانپ کے ڈسنے سے مر چکی ہے۔ اس کا شور سن کر پڑوسی چلے آئے اور گھر ماتم میں بدل گیا۔

کامنی کا کریا کرم بھی ہوگیا۔ بملا اور سدھارتو کو چپ سی لگ گئی تھی۔ بملا ایک ہی دہائی دیتی۔ ہائے میرا پوتا، پوتی نہ آئے۔ موت آگئی سدھارتو کی قسمت کتنی کھوٹی ہے۔ کئی دن گزر گئے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے" کے مصداق دن گزر رہے تھے۔

آخر کار سب رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگا۔

بملا کی خواہش پھر زور پکڑنے لگی۔ آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ کئی لوگوں سے کہا۔ مگر لوگ اپنی بیٹی دینے سے وہم کرنے لگ گئے۔ آخر کار کرمو ماچھی کے دور پار کے جاننے والوں میں بملا کو اپنا گوہر مقصود مل گیا۔ یہاں بھی سدھارتو کا روپیہ کام آیا پیسہ لڑکی والوں کا منہ بند کر دیتا۔ ارے موت تو کسی کو بھی، کہیں بھی آسکتی ہے۔ کبھی بھی آسکتی ہے۔ اس میں بملا یا سدھارتو کا کیا دوش؟ یوں ماجھو کسان کی دوسرے نمبر والی بیٹی لاجونتی سدھارتو کے لیے منتخب ہوگئی۔ اٹھارہ سالہ لاجونتی نٹ کھٹ اور خاصی تیز طرار، پھرتیلی تھی، بملا اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ ایک ماہ کے بعد لاجونتی سدھارتو کی پتنی بن کر آگئی۔ سدھارتو نے اگرچہ اس بار کافی ہاتھ پاؤں مارے مگر بملا کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ لاجونتی کمسنی اور خوبصورتی میں یکتا تھی۔ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی کہ سدھارتو آگیا۔ اسے دیکھا، گلے لگایا۔ ہار پہنایا، لاجونتی نے اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں شرم وحیا کم اور شرارت، تیزی طراری زیادہ تھی۔ سدھارتو نے شدید سر درد کی شکایت کی تو وہ سنجیدہ ہوگئی۔ میں سر دابوں؟ وہ ادا سے بولی۔

ہاں ___ میں لباس بدل کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ لباس تبدیل کر کے آگیا اور لاجونتی بار بار اس کا سر دباتے ہوئے اس کے قریب ہوتی، مگر سدھارتو کے اندر کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس کے برعکس لاجونتی کے اندر جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔ سدھارتو آخر کار خراٹے لینے لگا۔

لاجونتی کو بیچ پر کانٹے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ صبح ہوئی تو سدھارتو معذرت کرنے لگا۔ لاجونتی لمحہ بھر کو بہل گئی اگلی رات پھر سدھارتو بخار کا کہہ کر سونے لگا۔ لاجونتی کے سامنے اس نے دوائی بھی کھائی۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔

وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔ پتی کی یہ حالت اور تجھکو مستیاں سوجھ رہی ہیں۔ یوں اگلے دن کئی سدھارتو بخار اور طبیعت خرابی کا بہانہ کرتا رہا۔ لاجونتی کا صبر اب منہ کو آنے لگا تھا۔

پہلی دو تو چل بسیں۔ لاجونتو مجھے جلدی جلدی بچے کی خوشخبری سنانا۔ بملا مہینے بعد ہی کہہ اُٹھی۔ لاجونتی نے غور سے ساس کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں خواہش ہمک رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔

پہلی دو سے بچہ کیوں نہ ہوا؟ انہی چکروں میں دو ماہ بیت گئے۔ کرموماچھی آیا۔ اس نے ایک بڑی پانی کی بھری ہوئی بوتل بملا کو دی کہ بہو کو پلا دے۔ خاص دم کیا پانی ہے۔ اس کی برکت سے ضرور جلد بچہ ہو جائے گا۔ بملا کے مارے تشکر کے آنسو نکل آئے۔

اس کے جانے کے بعد بملا نے لاجونتی کو بلا کر یہ پانی پلایا اور پورا ایک ماہ پینے کی تاکید کی۔ بلکہ وہ اسے پانی سامنے ہی پلانے لگی۔ مبادا لاجونتی غفلت کرے یا پانی گرا دے۔

کرموماچھی ایک ہفتے بعد چل بسا۔ بملا اداس تھی مگر شکر ادا کرتی کہ اس نے اُسے پانی لا کر دے دیا تھا۔ اب پانی کون لایا کرے گا؟ یہ سوال تھا میں جایا کروں گی گھاٹ پہ پانی بھرنے۔ اچانک ہی لاجونتی نے کہہ دیا کوئی انتظام ہو جائے گا۔ بملا بولی میں تو جانے سے رہی۔

نہ ماں جی میں جاؤں گی۔ سب جاتی ہیں۔ کچھ ہی دیر لگے گی۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے اوبھ جاتی ہوں۔

سدھارتو سے بات کرنی پڑے گی۔ بملا نے کہا اور سدھارتو سے بات کی تو وہ تھوڑی حیل وحجت کے بعد مان گیا۔

یوں اگلے دن لاجونتی سر پہ مٹکا رکھے آس پاس کی عورتوں کے ساتھ جانے لگی۔ سدھارتو کے بارے میں باتیں سنتی کوئی طنز کرتا تو کوئی اس کے ساتھ ہمدردی، لاجونتی خاموش رہتی۔ پانی بھرتی۔ کبھی صبح باری آئی، تو کبھی شام کو زیادہ عورتیں صبح ہی آتی تھیں۔ لاجونتی کی باری دیر سے آتی۔ یوں اس نے شام کو جانا شروع کر دیا۔ بملا نے اعتراض کیا مگر وہ اڑ گئی۔ سدھارتو ویسے رات تک آتا تھا۔

باہر کی دنیا لاجونتی کے لیے سودرگ کی طرح تھی۔ کھلی آزادی۔

اسی گاؤں کے چودھری کے بیٹے نے اسے دیکھ لیا۔ اور پیچھے ہی پڑ گیا۔ لاجونتی پہلے نظر انداز کرتی رہی۔ پھر جذبوں کی یورش سے قربتیں بڑھنے لگیں۔ وہ جان بوجھ کر شام کو آنے لگی۔ لکشمن اسے قریب کرتا۔ بوسے لیتا۔ دونوں جھاڑیوں میں گم ہو جاتے۔ لاجونتی کے منہ زور جذبوں کو تسکین مل رہی تھی ادھر بملا اسے تاکید سے پانی پلا رہی تھی۔ اب لاجونتی کے لب کھلتے، مسکراتے رہتے۔ گھر کے کاموں کے دوران وہ گنگناتی رہتی، بملا بھی خوش تھی لکشمن اور لاجونتی کی محبتیں بڑھ گئی تھیں، دونوں حد پار کر چکے تھے۔ لاجونتی کو اب معلوم ہوا کہ جذبوں کی تسکین کیسے ہوتی ہے؟

کئی ماہ سے یہ کھیل جاری تھا۔ کہ لکشمن کو

شہر جانا پڑ گیا۔ ایسا گیا کہ اس کے آنے کی امید ہی نہ رہی۔ پھر پتہ چلا کہ وہ دوبئی چلا گیا ہے۔ لاجونتی کا کلیجہ مسلا گیا۔ وہ بے کل بے کل پھرنے لگی تھی۔ سدھارتو سے نباہ ہو رہا تھا۔ نباہ کر رہی تھی۔ سدھارتو نے اسے دبا کر رکھا ہوا تھا۔ کہیں کچھ بول نہ دے۔ ابھی تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب تھا۔

ایک صبح لاجونتی جاگی۔ سدھارتو جا چکا تھا۔ اس کا جی متلا رہا تھا۔ وہ الٹیاں کرنے لگی۔ بملا کے کان کھڑے ہو گئے۔ فوراً دائی کو بلا بھیجا۔ اس نے لاجونتی کے پیٹ سے ہونے کی تصدیق کر دی۔ بملا کے پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ آس پڑوس کی عورتیں مبارک دینے آنے لگیں۔ کرمو ماچھی کے متبرک پانی نے اثر دکھا دیا تھا۔ بملا نے لاجونتی کو بستر سے نہ ہلنے دیا اور مٹھائی منگوالی۔ سارا دن اسے سدھارتو کا شدت سے انتظار رہا۔ کہیں شام ڈھلے وہ آیا۔ تو بملا نے مٹھائی کی پلیٹ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے رکھی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے ظاہر تھی۔ کس خوشی میں ماں ہے یہ مٹھائی_ وہ قدرے بیزاری سے بولا تھا۔

ارے تو باپ بن رہا ہے۔ بملا کا بس نہ چل رہا تھا کہ اٹھ کر ناچنا شروع کر دے۔ کپکپاتے ہونٹوں سے اس کے اندر سے بھی جملہ ادا ہوا باپ۔ سدھارتو بمشکل آدھا رشگلہ نگل کر حیرت سے بولا باپ_ ہاں_ لاجوا ندر ہے۔ جا، جا۔ جا کر اسے اپنے ہاتھوں سے یہ مٹھائی کھلا۔ بملا نے اسے مٹھائی کی پلیٹ تھمائی اور کمرے کی طرف بھیجا۔ سدھارتو غائب دماغی سے کمرے میں آ گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ لاجونتی بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجب غرور طنطنہ تھا۔

کیا ہے یہ سب__ سدھارتو نے دھاڑ کر بولا۔

رام نے مہربانی کر دی مجھ پر۔ لاجونتی گھمنڈ سے بولی۔

کس کا ہے یہ بچہ؟ - حرامزادی_ وہ گالم گلوچ پہ اُتر آیا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ لاجونتی کا گلا ہی دبا دے۔

تمھارا_ ہمارا اور کس کا ہے؟ وہ برفی کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

بکواس بند کرو۔ ناجائز بچے کو میرا کہہ کر میرا دماغ خراب مت کرو۔ وہ چیخا۔

نہ۔ نہ۔ نہ۔ سادھو جی۔ ایسا نہ بولیں وہ نرمی سے بولتے بولتے سخت بولی اور سنو۔ میں نے تمھاری لاج رکھی - تمھاری پہلی دو بیویوں نے بھی زبان نہ کھولی۔ تو تم میری لاج رکھو۔ میں تمھاری لاج رکھوں گی۔ اور یہ بچہ ہو گا۔ لاجونتی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولی، تو سدھارتو بے جان بت کی طرح ہو گیا۔

لاجونتی نے اس کی بولتی بند کر دی تھی۔ اب جو تھا، جیسے تھا، اسے قبول کرنا تھا۔ اپنی خامی کو چھپانے کے لیے، بملا کی خوشی کے لیے، اس سماج کے لیے۔

☆☆☆☆☆

"گڑیا"

نور کمال شاہ

دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ اس کی گونج دور دور تک پہنچ گئی - اس کے ساتھ ہی دھول، مٹی اور دھویں کے بادل آسمان کی جانب اٹھتے چلے گئے اور آہستہ آہستہ اردگرد کے پورے علاقے میں پھیل گئے - چھوٹے چھوٹے سنگریزے دور تک ہوا میں اڑتے چلے گئے اور دور کہیں جا کر غائب ہو گئے- سنگ مرمر کے بھاری دیو قامت چٹانوں کا ایک حصہ بھاری خوفناک آواز کے ساتھ نیچے آن گرا اور فضا سفید دھول سے بھر گئی- بڑے دھماکے کے بعد تین چار چھوٹے چھوٹے دھماکے اور ہوئے جس کے بعد خاموشی چھا گئی - دو تین منٹ تک سکوت کے بعد کوہ کن اور کان کن فاصلے پر واقع بھاری چٹانوں کی آڑ سے نکل آئے اور سنگ مرمر کے گرے ہوئے ملبے کے پاس جمع ہونا شروع ہو گئے- پہاڑی سے نیچے تقریباً آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع سڑک پر رُکی ہوئی ٹریفک رواں ہو گئی - سواروں نے سکون کا سانس لیا اور کھڑی گاڑیاں اپنی اپنی منزل کے جانب تیزی سے بھاگنے لگیں- پتھر لے جانے والے ٹرک جو نیچے کھڑے تھے اب تک، آہستہ آہستہ اوپر بلندی پر واقع کان کی جانب رینگتے لگے اور سنگ مرمر کے گرے ہوئے ڈھیر کے قریب ایک ہموار جگہ پر آ کر رک ہو گئے -

رحیم گل بھی بھاری چٹان کی آڑ سے نکل کر گرے ملبے کی جانب بڑھا جہاں اس کے دوسرے نو دس ساتھی پہنچ چکے تھے- کام کا آغاز کر دیا گیا - سنگ مرمر کے بڑے مضبوط پتھروں کو بڑے بڑے بھاری ہتھوڑوں کی مدد سے توڑا جانے لگا اور برابر کرا کے ٹرکوں میں لوڈ کیا جانے لگا-

یہ سنگ مرمر کے کان میں کام کرنے والے کان کن تھے جو بارُود کی مدد سے بھاری پتھروں کو توڑ اور گرا کر ٹرکوں میں بھرتے تھے اور یہی ٹرک ان قیمتی پتھروں کو صوبے اور ملک کے مختلف شہروں میں واقع کرش فیکٹریوں تک پہنچا آتے تھے - ان فیکٹریوں میں اس سفید بے داغ پتھروں کو مشینی آروں سے چیر کر خوبصورت رنگوں کے دلکش چمکدار ماربل کے مہین سلوں میں تبدیل کر دیا جاتا تھا - ان چمکدار چکنی سلوں کے استعمال سے بنگلوں، محلوں اور

کوٹھیوں کی شان بڑھ جاتی تھی اور ان کے اندر بسنے والا خاندان خود کو کسی اور دنیا کا باسی سمجھنے لگتا تھا۔

شام سے ذرا پہلے رحیم گل کام نمٹا کر دھول سے اَٹا، گھر کی جانب روانہ ہوا۔ تھکن سے چور اور جسم کا ایک ایک جوڑ دکھتا ہوا، مگر اس کے باوجود اس کی چال میں جوش اور توانائی موجود تھی۔ خوش اور مطمئن انداز میں گھر کی جانب بڑھتا ہوا، جہاں اس کی بیوی اور تین سالہ بیٹی شدت سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

رحیم گل تیس پینتیس سال کا خوبرو جوان تھا جس کی جوانی کو سخت مشقت والے کام اور کٹھن حالات نے کملا کر رکھ دیا تھا۔ برے حالات نے تعلیم سے دور رکھا اور فقط دسویں پاس کرنے کے بعد غم روزگار کے چکروں نے آن گھیرا۔ کام اور کاروبار کے لئے پھوٹی کوڑی تک پاس نہیں تھی، اس لئے علاقے کے بازار اور ارد گرد آبادی میں معمولی مزدوری کر کے اپنے کنبے کا پیٹ پالتا رہا۔ اب پچھلے تین چار سال سے وہ سنگ مرمر کے کان میں کام کر کے بچوں کے لئے شکم پروری کا سامان کر رہا تھا۔ گھر میں ایک بے کس و مجبور ماں کے علاوہ بیمار باپ اور ایک چھوٹی بہن اسی کے آسرے پڑے تھے۔ جن میں اب اس کی بیوی اور تین سالہ لاڈلی بیٹی بھی شامل ہو چکے تھے۔ بیوی اور اس کے بعد بیٹی کے آنے سے رحیم گل کی بے رونق زندگی زیادہ رنگین اور دلکش نظر آنے لگی تھی۔ گاؤں ہی میں بسنے والی، اپنے والد کے قریبی دوست کی بیٹی نجمہ دلہن بن کر رحیم گل کی زندگی کو پر بہار بنا چکی تھی۔ نجمہ سمجھدار، سگھڑ اور خوش اخلاق تھی اور بہت جلد اس نے شوہر کے ساتھ ساتھ ساس اور سسر کے دل میں بھی جگہ بنالی تھی۔ رہی سہی کمی لاڈلی بیٹی کرن نے آ کر پوری کر دی، اور یوں رحیم گل کو اب زندگی کی سختیوں کا احساس کم ہی ستاتا تھا۔ کان میں سخت مشقت کے بعد اسے اتنے پیسے مل جاتے جس سے ان کا گذر بسر آسانی سے ہونے لگا تھا۔ نجمہ بھی کپڑوں اور دوپٹوں وغیرہ پہ پھول اور بیل بوٹے کاڑھنے کا ہنر جانتی تھی اور یوں وہ بھی آس پاس کے خواتین کے کپڑے کاڑھ کر گھر کے حالات کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتی رہتی۔

رحیم گل نے بھی اب اپنے حالات اور موجودہ زندگی سے سمجھوتا کرنا سیکھ لیا تھا، اس وجہ سے اب کوئی وقتی جوش یا ہیجان اس کے جذبوں کو بڑھکا کر آگ نہیں لگاتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اسی ڈھنگ سے ہی زندگی گزارنی ہے اس لئے وہ مطمئن اور پر سکون ہو چکا تھا۔ بیوی کی سلیقہ مندی اور کفایت شعاری کے باعث وہ اپنی بہن کی شادی کرا چکا تھا اور ہر مہینے کسی نہ کسی طرح

والد صاحب کے دواؤں کے لئے پیسے بھی نکل ہی آتے تھے کیوں کہ یہ ضروری تھا۔

ان کی خاموش جھیل کی مانند پرسکون اور ساکن زندگی میں ارتعاش اس وقت پیدا ہوا جب کرن نے ہمسائی کی بیٹی کے ہاتھ میں کل والی گڑیا دیکھ لی۔ یہ گڑیا بڑی تھی اور برقی چارج کے ذریعے چلتی تھی۔ جب اس کا بٹن دبا دیا جاتا تو نہ صرف بچوں کے مانند مٹک مٹک کے چلنا شروع کر دیتی بلکہ ساتھ ہی گانا بھی شروع کر دیتی تھی۔ کرن نے رحیم گل سے اسی قسم کی گڑیا کا تقاضا شروع کر دیا۔

''بابا! میرے لئے بھی ایسی ہی گڑیا خرید کر لاؤ نا جیسی ستارہ کے پاس ہے۔'' وہ بڑے لاڈ سے فرمائش کرتی۔

''ہاں میری چندا! میں ضرور لاؤں گا، بس ذرا پیسے آ لینے دو، جیسے ہی میرے ہاتھ پیسے آئیں گے، میں اس سے بڑھیا گڑیا خرید کر لاؤں گا اپنی گڑیا کے لئے؛ اب خوش۔''

گزرتے دنوں کے ساتھ ہی بچی کا مطالبہ بڑھتا ہی رہا۔ گھر میں بنی ہوئی گڑیا اور بازار میں عام دستیاب چھوٹی اور معمولی گڑیا کے ذریعے اسے مطمئن کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں مگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آئی۔ پھر بھی رحیم گل ہر دفعہ وہی گڑیا دلانے کا وعدہ کر کے اسے ٹالتا رہا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ بچی سے کیا ہوا وعدہ کبھی پورا نہیں کر سکے گا۔ اسے گڑیا کی قیمت کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اتنی بڑی اور قیمتی گڑیا دو اڑھائی ہزار سے کم کی نہیں مل سکتی تھی اور رحیم گل کے لئے اتنی بڑی رقم محض ایک بے کار اور بے مقصد سے کھلونے پر خرچ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی گڑیا خریدنے کی استطاعت اسے شائد کبھی بھی نصیب نہیں ہوگی۔ کھلونے بنانے والے کاریگر بڑے چالاک ہوتے ہیں؛ اس قسم کے قیمتی کھلونے غریب اور نادار لوگوں کے لیے بناتے ہی نہیں۔ بلکہ ان کھلونوں سے کھیلنے کے لئے بڑے لوگوں کے بچے موجود ہوتے ہیں۔ رحیم گل کا پڑوسی کوئی بڑا آدمی تو نہیں تھا، کسی سرکاری دفتر میں معمولی سا بابو تھا مگر رحیم گل جانتا تھا کہ ان لوگوں کے لئے پیسے حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا تبھی تو ان کے بچے قیمتی کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ پھر بھی اس نے کرن سے وعدہ کر لیا تھا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ کاش! وہ بچی کی فرمائش کسی طرح پوری کر سکتا۔

رحیم گل نے بالآخر بچی کے ضد کے آگے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ اپنی ضرورتوں کو محدود کر کے پیسے اکٹھے کرنے کا آغاز کر دیا۔ اب آمدن تھی ہی کتنی؛ پانچ چھ سو روپے یومیہ اور مہنگائی کا زمانہ۔ بچت کہاں سے اور کیسے ہو؛ یہ ایک مشکل سوال تھا۔ گھر میں آنے والے

دودھ کی مقدار آدھی کر دی گئی؛ گوشت کا وقفہ تین چار دنوں سے بڑھ کر ہفتہ دس دنوں تک ہو گیا اور ایک دو ماہ میں کسی نہ کسی طرح گڑیا کے پیسے نکل ہی آئے اور آج وہ دن آ چکا تھا کہ بچی کی فرمائش پوری کی جا سکے۔ صبح کام پر جاتے ہوئے رحیم گل اپنے ساتھ پیسے لیتا گیا تا کہ واپسی میں کرن کے لئے گڑیا خرید لائے۔ کرن کا چہرہ آج خوشی سے چمک رہا تھا۔

چٹانوں کے بیچ بارود نصب کیا جا چکا تھا، صرف فیتے کو دیا سلائی دکھانے کی دیر تھی جس کے لئے مقرر بندہ تیار کھڑا تھا۔ وہ فقط اشارے کا منتظر تھا۔ ساتھیوں کی طرف سے اشارہ ملتے ہی اسے بارود کو آگ دکھا کر پھرتی سے بھاگ کر محفوظ چٹان کی آڑ میں پہنچ جانا تھا۔ نیچے سڑک پر ٹریفک خاصا فاصلہ رکھ کر روکی جا چکی تھی کہ مبادا بارود کے زور سے سنگ مرمر کے اڑتے ہوئے ٹکڑے گر کر کسی گاڑی یا سوار کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ اشارہ دینے والے دوست نے چاروں طرف پھرتیلی نظروں سے دیکھا اور مطمئن ہو کر اشارے کے لیے ہاتھ بلند کر دیا۔ فیتے کو آگ دکھائی گئی، ایک دو تین ... اور فضا خوفناک دھماکے سے لرز اٹھی۔ دھول، مٹی اور کنکروں کا طوفان آسمان کی جانب اٹھا اور چٹان کا ایک بڑا حصہ خوفناک آواز کے ساتھ نیچے آ رہا۔ سنگ مرمر کے بڑے اور بھاری ٹکڑے لڑھکتے ہوئے کان کے نیچے ہموار جگہ پر آ کر ڈھیر ہو گئے۔

دو تین منٹ کے سکوت کے بعد جب فضا صاف ہو گئی تو رحیم گل اور اس کے ساتھی آڑ سے نکل کر ملبے کی جانب بڑھے اور حسب معمول ٹرکوں کی بھرائی کا کام شروع ہوا۔ ابھی وہ چند پتھر ہی اٹھا کر ٹرک میں ڈال چکے تھے کہ قسمت نے اپنا کھیل دکھانا شروع کر دیا۔ اوپر چٹان کا باقی حصہ جو دھماکے سے ہل چکا تھا اچانک بلائے ناگہانی کے مانند خوفناک آواز کے ساتھ نیچے آ رہا اور نیچے کھڑے ٹرک اور کام میں مصروف بے چارے مزدور بھاری پتھروں کے نیچے دب گئے۔ کہرام مچ گیا۔ فضا مزدوروں کی دل خراش چیخوں سے گونج اٹھی۔

پہاڑی سے نیچے معمولات زندگی میں مصروف لوگوں اور پاس کی آبادی کو صورت حال سمجھنے میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ بھاگ کر اوپر کان کی جانب بے تحاشا دوڑ پڑے۔ ہر طرف پتھر اور ملبہ بکھرا پڑا تھا۔ ہر چیز بھاری پتھروں تلے دب چکی تھی۔ دو ٹرک جو اس وقت چٹانوں کے عین نیچے کھڑے بھرے جا رہے تھے وہ بھاری پتھروں کے نیچے بری طرح پچک چکے تھے اور پتھروں میں گھرے ان کے ٹوٹے پھوٹے خستہ حال ڈھانچے ہی نظر آ رہے تھے۔

سنگ مرمر کا کان گرنے کی خبر جنگل کے آگ کی طرح آناً فاناً ہر جگہ تک پہنچ گئی۔ لوگ امداد

کے لئے پہنچنا شروع ہو گئے۔ انتظامیہ نے بھی امدادی کاموں کے لئے فوراً ہی عملہ بھیج دیا۔ کام کرنے والے مزدوروں کے لواحقین بھی چیختے چلاتے وہاں پہنچ چکے تھے اور دیوانہ وار پتھروں کو ادھر ادھر ہٹا اور پھینک کر اپنے پیاروں کو ملبے تلے تلاش کر رہے تھے۔ بھاری پتھروں کو کرین کے ذریعے ہٹایا جانے لگا۔ چار شدید زخمیوں کو نکال کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ تین جاں بحق افراد بھی ملبے تلے سے نکال لئے گئے مگر رحیم گل کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس کی برقع میں لپٹی بیوی اپنی چھوٹی بیٹی سمیت پہنچ چکی تھی اور مسلسل چیخ و پکار سے ماحول کو انتہائی غمزدہ بنا رہی تھی۔ ٹرکوں کے اردگرد سے پتھر ہٹاتے اچانک کسی انسان کے کراہنے کی آوازیں ایک بندے نے سن ہی لیں۔ تمام توجہ ادھر مبذول کرا کے وہاں سے احتیاط کے ساتھ تیزی سے ملبہ ہٹایا جانے لگا اور آخر کار کراہنے والا زخمی نکل ہی آیا۔ یہ رحیم گل تھا جو انتہائی بھاری پتھروں کے بیچ سے نکل آیا تھا مگر معجزہ رونما ہو چکا تھا۔ وہ زندہ تھا اور زیادہ زخمی ہونے کے باوجود سانسیں لے رہا تھا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ ٹرک کی آڑ نے اسے بچا لیا تھا یا معصوم کرن اور بابا کی دعاؤں نے۔ ملبہ گرتے وقت وہ شائد بھاری پتھر لوڈ کرنے کے بعد ٹرک کے سائے میں کھڑا سانسیں بحال کر رہا تھا کہ اس وقت کان گرپڑی اور وہ ٹرک کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے اگرچہ ملبے تلے دبے ٹرک کے نیچے تو آ گیا مگر کچلنے سے محفوظ رہا۔ پتھر لگنے سے اس کے جسم پر بے شمار زخم آئے تھے مگر وہ اس وقت ہوش میں تھا۔ اسے فوراً ہسپتال روانہ کیا گیا۔ اس کی بیوی بھی تین سالہ بچی کا ہاتھ تھامے، بھاگتے دوڑتے ان کے ساتھ ہی ہسپتال پہنچی۔ اس کا باپ بھی معذور ہونے باوجود کسی طرح ہسپتال پہنچ چکا تھا کہ اسے تمام خبریں ہمسائے کے زبانی مل چکی تھیں؛ والدہ ہسپتال تو نہ آ سکی تھیں مگر اس نے گھر میں ہی مصلا سنبھال لیا تھا اور گڑگڑا کر بیٹے کے سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

رحیم گل کا سارا جسم زخموں سے چور تھا مگر خوش قسمتی سے سر محفوظ تھا اور ہڈیاں بھی ٹوٹنے سے بچ گئیں تھیں۔ پتھروں کے لگنے سے بے شمار خراشیں آئیں تھیں اور ان سے بہنے والے خون نے اس کے خاک آلودہ کپڑوں کو سرخ رنگ میں رنگ دیا تھا۔ ڈاکٹروں نے فوراً ہی اس کا معائنہ کیا اور زخموں کو صاف کر کے مرہم پٹی کرا دی گئی۔ وہ محفوظ تھا اور کوئی خطرے والی بات نہیں تھی مگر اسے فی الفور گھر جانے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ ایک دن کے لئے ہسپتال میں روک دیا گیا تاکہ مرہم پٹی بروقت اور صحیح طریقے سے کرائی جا سکے اور بروقت پٹی تبدیل بھی ہو سکے۔ کرن اور اس کی ماں ہسپتال میں ہی ٹھہر گئے۔ باپ کے سرہانے

بیٹھی کرن مسلسل رو بھی رہی تھی۔ تھکن کی وجہ سے بدحال رحیم گل ایک گھنٹے کے اندر بہتر حالت میں آ گیا تھا۔ وہ ٹھیک تھا اور اب حرکت کرنے کے بھی قابل تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر پاس کھڑی کرن کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ نہایت ہی مدھم آواز میں پکارے، ''کرن، میری چندا!!'' ۔ اسی لمحے تین چار سالہ معصوم کرن باپ کے اوپر جھک گئی اور اس کے کان کے قریب منہ لاتے ہوئے معصومیت سے بول پڑی،

''میری گڑیا کے لئے تم نے یہ زخم کھائے ہیں نا، یہ کیوں، اور پتہ ہے بابا، دادا جان دوپہر کو میرے لئے گڑیا لا چکے ہیں؛ بہت پیاری سی گڑیا۔''

رحیم گل کی نظریں بے اختیار پاس بیٹھے والد کی جانب اُٹھیں۔ ''مگر دادا جان کے پاس پیسے کہاں سے آ گئے۔'' رحیم گل نے انتہائی حیرت سے پوچھا تو کرن معصومیت سے بولی، ''اس کے پاس پیسے تھے بابا، تم جو دواؤں کے پیسے اسے دیتے ہو اسی میں سے بچائے تھے؛ وہ پوری دوا نہیں لاتے بلکہ ہر دفعہ آدھی لے کر آتے ہیں اور اسی رقم سے انھوں نے میرے لئے گڑیا خریدی ہے مگر بابا! مجھے گڑیا نہیں چاہیے؛ تم ٹھیک ہو جاؤ۔ دادا جان ٹھیک ہو جائیں، تم لوگ صحیح سلامت رہو یہ میرے لئے ہزاروں گڑیوں سے بڑھ کر ہے، کل گڑیا واپس کر دنی ہے بابا۔''

''نہیں میری گڑیا، میرا کیا ہے، زندگی کی گاڑی ویسے بھی کنارے لگنے والی ہے؛ اتنی دوائیوں کا کیا کرنا ہے، بس سانس کی ڈور کٹنے تک کا سفر ذرا کم تکلیف کے ساتھ طے ہو، اسی تگ و دو میں ہوں۔'' بابا جان نے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

رحیم گل نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ننھی کرن کا معصوم ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگایا اور روتے روتے اسے دیوانہ وار چومنے لگا۔ پاس سے گزرنے والے ڈاکٹر صاحب نے شاید کرن کی معصوم باتیں سن لیں تھیں؛ وہ ان کے پاس آ کے رکے اور بچی کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر بولے، ''اب شائد اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، صوبائی حکومت نے کان حادثے کے متاثرین کے لئے امدادی رقم کا اعلان کر دیا ہے۔ کل ضلعی انتظامیہ کے افسران آ کر ایک لاکھ روپے کا چیک آپ کے حوالے کر دیں گے اور میرے خیال میں گڑیا کی قیمت اس سے باسانی نکالی جا سکے گی اور یقیناً بابا جی کے دواؤں کی بھی...!!!!''

معصوم کرن اپنی بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا اُٹھی۔

☆☆☆☆☆

اگر تم ایک گھوڑے ہوتے۔۔

''اگر تم ایک گھوڑے ہوتے تو میں گولی مار کر۔۔ تمھارا۔۔ بھیجا۔۔۔ اڑا دیتا۔۔۔''

ایک گھوڑا ہی کیوں؟ کوئی اور جان ور کیوں نہیں، کتا، بلی، چوہا یا کوئی بھی دوسرا جان ور ہوتا تو گولی اس کی کھوپڑی سے بھی گزر سکتی تھی۔

ہوش سنبھالتے ہی جو پہلی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی، وہ آج تک اسے بھول نہیں سکا تھا۔ یہ آواز اس کے چاروں طرف گونج رہی تھی۔ یہ آواز کسی اور کی نہیں اس کے اپنے باپ کی تھی۔ اس کا باپ اکثر اس خواہش کا اظہار کرتا رہتا تھا۔

''کاش میرا بیٹا ایک گھوڑا ہوتا''۔

شاید وہ دنیا کا پہلا باپ تھا جس کی خواہش تھی کہ اس کے گھر میں پیدا ہونے والا، اس کا اکلوتا وارث، انسان کے بجائے ایک گھوڑا ہوتا۔

اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کو گھوڑوں سے شدید نفرت ہے، اس لیے وہ اپنے غصے کا اظہار اس بات سے کرتا ہیں اور جب اس کو پیار آتا ہے تو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کاش میرا بیٹا ایک گھوڑا ہوتا۔ اس نے اپنے طور پر یہ تصور کر لیا تھا کہ اس کا باپ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت اپنے بیٹے سے کرتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ باپ نے آج تک کسی دوسرے شخص کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔

''کاش تم ایک گھوڑے ہوتے ۔ میں تمھیں گولی مار دیتا اور وہ تمھارے دماغ کی رگوں کو چیرتی ہوئی آگے نکل جاتی''

اس کے لاشعور میں یہ بات کہیں موجود تھی کہ اس کے باپ کے لیے روئے زمین پر سب سے زیادہ نفرت کے قابل انسان کوئی اور نہیں خود اس کا اپنا بیٹا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا یہ بات اس کے لاشعور میں اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی۔

جب وہ جوان ہوا تو یہ خیال اس کے لاشعور کے کسی کونے کھدرے میں دب گیا۔ اس نے تمام منفی سوچوں کو جھٹک کر اپنے

غسان کنفانی
مترجم: محمد افتخار شفیع

خیالات کو ایک نقطے پر یک جا کر لیا۔ اب وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کا باپ گھوڑوں سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے، اسے ان کے ساتھ وقت گزارنا، ان کی دیکھ بھال کرنا اچھا لگتا ہے۔

ایک روز اس نے باپ کا موڈ ذرا ٹھیک دیکھ کر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''ابا جان! آخر آپ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں ایک گھوڑا ہوتا۔ آپ کی ملکیت میں ہمیشہ نایاب نسل کے گھوڑے رہے ہیں۔ آپ نے تمام عمر گھڑ سواری کی ہے، میں آپ کی اس عجیب سی خواہش کا سبب جاننا چاہتا ہوں''۔

اس کی بات سن کر باپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ دکھائی دے رہا تھا، تھا، پھر وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا:

''تم یہ بات نہیں سمجھو گے''

''بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں گھوڑے کو مارنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں اس عمل کو فائدہ مند سمجھا جاتا ہے''۔

''لیکن میں گھوڑا تو نہیں ہوں''۔ اس نے معصومیت سے کہا۔

''میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں''۔ اس کے باپ نے جواب دیا

یہ کہہ کر اس کا باپ نے دوسری طرف مڑا، وہ شاید کھیتوں کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس نے باپ کی طرف سے تسلی بخش جواب نہ ملنے پر احتجاج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ آگے بڑھا اور باپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

باپ نے بیٹے کو سر سے لے کر پاؤں تک چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں کسی بھیڑیے کی سی چمک تھی، باپ کا یہ انداز دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

آخر اس کا باپ اس سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔ اس نے بے ساختہ انداز میں پوچھ لیا:

''آخر آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟'' اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔

''میں اپنے بیٹے سے کیسے نفرت کر سکتا ہوں''۔ باپ نے جواب دیا۔

''تو پھر کیا وجہ ہے''

''میں نفرت نہیں کرتا بل کہ تم سے خوف زدہ ہوں''

کچھ دیر کے لیے خاموشی کا وقفہ ہو گیا جو خاصا طویل ہوتا گیا۔ اس نے باپ کا رستہ چھوڑ دیا۔ اس روز اسے اپنا وجود بہت بھاری محسوس ہوا، لیکن وہ یہ جان گیا تھا کہ یہ بوڑھا شخص اس سے بے حد محبت کرتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے اس نے

گھڑسواری کے شوق کو اچانک ترک کر دیا تھا۔ اس بدقسمت باپ کی تنہائیوں اور نارسائیوں کی ماری زندگی میں کون سے ایسے راز پوشیدہ تھے، آخر وہ اپنی جوان بیوی کے انتقال کے بعد نوزائیدہ بچے کو لے کر کیوں شہر چلا آیا۔ یہ سارے مشکل فیصلے تھے لیکن اس کے باپ کو کرنے پڑے۔ اس نے اپنے سارے گھوڑے اور چراگاہیں کیوں بیچ دی تھیں۔ اف!! اس کی چراگاہیں۔۔۔ جہاں اس کی پسندیدہ گھوڑیاں چرتی تھیں، سمارہ، بیدہ، اور صبا۔۔۔ اور ایک گھوڑا جس کا نام باراک تھا۔ یہ سب کچھ برداشت کرنا، اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن اسے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔

اس کے والد نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا تھا۔ کسی بھی نوجوان شخص کی زندگی میں اس طرح کے واقعات کا رونما ہونا عجیب ہے۔ اس کے اندر چھپے ہوئے غم کی شدت کو سمجھنا یا بیان کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ باپ کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ اعصابی طور پر شدید تناؤ کا شکار تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے باپ کے اس رویے کے پیچھے چھپے راز کو جاننا چاہتا تھا۔

ایک دن اس کا باپ آبائی گاؤں گیا ہوا تھا، اس کے بہت سے دوست احباب ابھی تک وہیں مقیم تھے اور وہ ان سے ملنے کے لیے آتا جاتا رہتا تھا۔ موقع غنیمت جان کر وہ اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا، وہ پہلے بھی اس کمرے میں آتا جاتا رہتا تھا لیکن آج اس کا دیکھنے کا انداز جدا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر چاروں طرف مختلف نسلوں کے گھوڑوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں نے کمرے کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر ان تصویروں کو دیوار سے اتارنے لگا۔ ایک تصویر کے پیچھے اسے خفیہ دراز نظر آئی۔ وہ چاقو کی مدد سے اسے کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ دراز میں سیاہ رنگ کی ایک چرمی ڈائری تھی، اس نے وہ ڈائری اٹھائی اور ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھنے لگا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ ڈائری اسے حقیقت تک ضرور رسائی دے گی اور وہ اپنے اعصاب پر حاوی گتھیوں کو سلجھا سکے گا۔

ڈائری نے اسے مایوس کیا، اس میں صرف گھوڑوں کی مختلف قسموں، عادتوں، نسلوں اور قیمتوں کے بارے میں بنیادی معلومات درج تھیں۔ اس کا باپ اپنے علم میں اضافے کے لیے یہ معلومات اس ڈائری میں درج کرتا جاتا تھا۔ اسے ڈائری میں چند نامکمل جملے ملے، یہ جملے قدرے عجلت یا لاپروائی میں لکھے گئے تھے۔ ایک جملے پر پہنچ کر اس کی نگاہ رک گئی۔ وہاں درج تھا:

"اسے بیچ دو یا مار دو"

نیچے واضح طور پر تاریخ بھی درج تھی: "۲۰ ستمبر ۱۹۲۹ء"

ذہن پر ذرا سا زور دینے سے اسے محسوس ہوا کہ الجھی ہوئی ڈور کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ اب وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ آگے درج تھا:

''یہ میرا سب سے قیمتی اور عزیز ترین گھوڑا ہے، اور پھر بھی یہ مجھے کہتے ہیں کہ بیچ دو یا مار دو''۔

''تاریخ: یکم دسمبر ۱۹۲۹ء ''

''میں باراک کو کبھی نہیں بیچوں گا، نہ ماروں گا۔ باراک میرا شان دار گھوڑا ہے۔ میں نے اتنا آرام دہ گھوڑا کبھی نہیں دیکھا، میں اسے کبھی نہیں بیچوں گا نہ ماروں گا''۔

کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ڈائری کے اوراق پلٹتے ہوئے اس کی نگاہ ایک جملے پر آ کر رک گئی۔ یہ اس ڈائری کا لکھا ہوا، سب سے پُراسرار جملہ تھا:

''وہ اسے دریا کے کنارے پر لے گیا اور کلہاڑے سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد اس نے دائیں پاؤں کی ٹھوکر سے اس کو دریا میں دھکا دے کر گرا دیا۔ بعد میں ابو محمد نے اس کے سر میں گولی ماردی تھی۔'' تحریر کے نیچے ۲۷ جولائی ۱۹۳۰ء کی تاریخ درج تھی۔

میری جب ابو محمد سے ملاقات ہوئی تو اس نے رک رک کر تفصیل سے بتایا کہ:

''میں تو پیدائش کے وقت ہی باراک کو مار دینا چاہتا تھا۔ مگر اللہ تمھارے والد کو معاف کرے، وہ میرے اس ارادے کے راستے میں دیوار بن کر آن کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا، گھوڑے کے ساتھ جب چند سال گزار لیے جائیں تو وہ (باپ یا بھائی کی طرح) آپ کے ساتھ ایک گہرا رشتہ بنا لیتا ہے۔ یہ اس جان ور کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اب بتاؤ، بھلا کوئی اپنے باپ یا بھائی کو قتل کر سکتا ہے؟''

''اللہ مجھے معاف کرے، میں نے یہ سخت سزا پانے کا گناہ کیا، باراک واقعی ایک خوب صورت ترین گھوڑا تھا۔ اس سے پہلے اتنا خوب صورت گھوڑا میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔''

''تمھارا باپ ایک ضدی آدمی تھا، اس نے ہماری ایک نہ سنی۔ اس نے گھوڑے کو مارنے دیا اور نہ ہی بیچ کر اس سے اپنی جان چھڑوائی''۔

''ابوابراہیم! اس پر کم از کم سواری تو مت کرو، مگر اللہ معاف کرے اس کو، وہ کسی کی بات کب سنتا تھا''

''تمھیں اپنی ماں کب یاد ہو گی۔ تم نے تو اسے دیکھا ہی نہیں۔ وہ ایک نہایت حسین عورت تھی۔ جو بھی اس سے ایک دفعہ مل لیتا تھا، اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اللہ تمھارے باپ کی زندگی آسان کرے، وہ تمھاری ماں

سے جنون کی حد تک عشق کرتا تھا۔ ان کے عشق کو مثالی قرار دیا جا سکتا ہے۔ تمھاری ماں واقعی ایک خوب صورت اور ذہین عورت تھی۔ ایک عورت میں ان دونوں خصوصیات کا اکٹھا ہونا بہت مشکل ہے۔''

''تمھارے ماں باپ کی شادی کو بس ایک سال ہوا تھا، تمھاری پیدائش کے کچھ دن بعد گھوڑے نے تمھاری ماں کو دریا میں پھینک دیا تھا''۔

''تم نے پوچھا ہے کہ ہم گھوڑے کو کیوں مارتے ہیں، میرے لیے اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے کہ ناممکن ہے۔ کوئی عقل مند اور تجربہ کار شخص ہی اس کا بات جواب دے سکتا ہے۔ میں ایک بڈھا کھوسٹ۔ آدمی ہوں، بہتر تھا تم کسی اور سے پوچھ لیتے''۔

''اور ہاں، ایک بات یاد رکھنا، تمھارا باپ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہاں جب سے تم پیدا ہوئے ہو وہ تم سے خوف زدہ رہتا ہے۔ اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو کبھی یہ سوال نہ کرتا''۔

اس کا باپ اس سے کیوں اتنا خوف زدہ تھا، یہ سوال اس کے لیے ایک معمہ تھا۔ کوئی چیز تھی جو اسے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا، شہر کے مختلف حلقوں میں لوگ اسے ایک شائستہ اور مہذب ماہرِ طب کے طور پر جانتے تھے۔ وہ ایک معزز آدمی تھا، اپنی اب تک کی زندگی میں نے کبھی کوئی پنگا بھی نہیں مارا تھا۔

''میں شہر میں ایک درد دل رکھنے والے ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور ہوں، تمام لوگ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں، مجھے ایک بے ضرر انسان سمجھتے ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے مریضوں کا میرے علاوہ کوئی اور آپریشن نہ کرے۔ ایک میرا باپ ہے جو مجھ سے انتہائی خوف زدہ رہتا ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''میرا باپ، میرا باپ، مجھ سے خوف زدہ رہنے والا دنیا کا واحد شخص''۔ وہ بڑبڑایا

ایک رات تو ایسا عجیب واقعہ ہوا جس نے اس کی زندگی کی بازی پلٹ دی، وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ اچانک اس نے اپنے باپ کے کراہنے کی آواز سنی۔ وہ بھاگ کر اس کے کمرے میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ انتہائی تکلیف دہ حالت میں بستر پر گرا پڑا ہے۔ اسے اپنڈکس کا درد تھا، حالت خطرناک تھی، اپنڈکس کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ ہسپتال کے عملے نے اس کو ابتدائی طبی امداد دی، اسے اسٹریچر پر آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا جا رہا تھا کہ اس کے باپ نے اچانک سوال کیا:

''میرا آپریشن کس ڈاکٹر نے کرنا ہے؟''۔

''آپ کا آپریشن اس شہر کا سب سے بہترین ڈاکٹر کرے گا۔۔۔ یعنی۔۔ آپ کا قابل فخر

بیٹا'' عملے میں سے کسی نے جواب دیا۔
یہ سنتے ہی اس کے باپ نے سٹریچر سے چھلانگ لگا کر فرار ہونے کی کوشش کی۔ جب وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو زور زور سے رونے اور شور مچانے لگا۔
''میں نے اپنے بیٹے سے آپریشن نہیں کروانا، تم کسی قصائی کو بلوالو، لیکن اس سے نہیں۔۔۔اف''۔ وہ زور سے چلایا
''کیوں اس کے ہاتھوں سے اب تک ہزاروں لوگ شفایاب ہوئے ہیں''۔ کسی نے کہا
لیکن بوڑھا باپ کسی ضدی بچے کی طرح مسلسل روئے جا رہا تھا۔
''وہ مجھے مار دے گا، وہ مجھے مار دے گا''۔ اس کی زبان پر بس یہی الفاظ تھے۔
''میں نہیں چاہتا کہ میری سرجری — میرا بیٹا کرے، مجھے کہا جائے کہ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو، اور ہسپتال میں اس وقت صرف ایک ہی ڈاکٹر موجود ہے، تمھارا بیٹا، میں پھر بھی اس سے آپریشن نہیں کراؤں گا''
ڈاکٹر بیٹے نے باپ کی یہ باتیں سنیں تو آبدیدہ ہو کر ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا، اس نے اپنی جگہ ایک اور ڈاکٹر کو آپریشن کے لیے بھیج دیا تھا۔ جس ڈاکٹر نے اس کے باپ کا آپریشن کیا تھا، بعد میں اس سے پاس آیا، اس کے ہونٹوں پر ایک حیران کن مسکراہٹ تھی، اس نے کہا:
''یقین مانو، تمھارے باپ کا آپریشن میرے کیریئر کا سب سے مشکل کام تھا، مجھے آج تک ایسا تجربہ نہیں ہوا، نشہ آور ادویات کے استعمال کی وجہ سے وہ مسلسل بڑبڑاتا رہا، اس نے مجھے کسی گھوڑے کو مارنے کی ایک عجیب داستان سنائی۔ ایک شیطانی قوت تھی جو گھوڑے پر حاوی ہو گئی تھی اور وہی قوت اس کی موت کا سبب بھی بنی''
''ڈاکٹر! کاش تم جان لیتے کہ تمھارے باپ کی یادداشت کتنی اچھی ہے۔ اسے اپنی جوانی کی ساری کہانیاں یاد ہیں۔ اس نے تمھاری ماں کی باتیں بھی بتائیں، باتوں باتوں میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، کہ میں اپنے پسندیدہ گھوڑے باراک کے قتل کا ذمہ دار ہوں''۔ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا
''اچھا، مجھے ساری باتیں ذرا تفصیل سے بتاؤ'' اس نے بے قراری سے پوچھا
''تمھارے باپ نے ایک گھوڑے کی کہانی سنائی جو ایک طوفانی رات میں پیدا ہوا تھا، یہ دو نسلوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والا دنیا کا خوب صورت ترین گھوڑا تھا۔ اس کا رنگ سرمئی تھا، اور گردن اور دم کے بال عام گھوڑوں سے زیادہ لمبے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کے جسم پر کوئی داغ نہیں تھا۔''
''جیسے ہی وہ گھوڑا پیدا ہوا، اس نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی، تمھارا باپ اس کی

مدد کرنے لگا، جیسے ہی وہ گھوڑا اپنے قدموں پر کھڑا ہوا، دیوار کے دوسری جانب سے اس کے پڑوسی ابو محمد کی آواز آئی۔ ابو ابرہیم! اس گھوڑے کو اسی وقت مار دو"۔

تمھارے باپ نے غصے سے پوچھا، وہ کیوں؟

ابو محمد نے جواب دیا، کیا تم نے اس کے جسم کے دائیں جانب خون کا دھبا نہیں دیکھا؟ اس دھبے کا مطلب ہے کہ یہ گھوڑا کسی روز تمھارے کسی بہت پیارے کی جان لے گا، یہ اپنے ساتھ شکار کا خون لے کر آیا ہے، اسے ابھی مار دو تو تمھارے حق میں بہتر ہوگا"

"مگر تمھارا باپ توہم پرستی کے سخت خلاف تھا، اس نے اس آرام دہ اور فرماں بردار گھوڑے کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد تمھارا باپ خاموش ہوگیا، سچی بات میں مجھے اس کہانی سے زیادہ اس کی خاموشی عزیز تھی، دراصل میں اس کہانی کو سن کر سحر زدہ ہوگیا تھا، میری توجہ آپریشن سے ہٹ رہی تھی، اس کی خاموشی کے بعد میں نے دوبارہ آپریشن شروع کیا"

"کیا تم نے زندگی میں کسی افسانوی کردار کو دیکھا ہے؟"

"کیا تم نے کبھی ایسا کوئی گھوڑا دیکھا ہے کو اپنی گردن پر شکار کا خون لے کر پیدا ہوا ہو، تمھارے باپ کو اس بات کا پورا یقین تھا، وہ اسے روحانی حد تک ایک اٹل حقیقت سمجھتا ہے، کیا تمھیں اپنے باپ سے آج تک ایسی جھوٹی سچی کہانیاں سننے کا موقع نہیں ملا؟"

ڈاکٹر اس کے باپ کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں صبح ہوگئی۔ وہ گھر پہنچا تو اس کے ساتھی ڈاکٹر کی باتیں ایک بگولے کی طرح اس کے دماغ میں تباہی مچا رہی تھیں۔ وہ بار بار ایک عجیب طرح کی ہیجانی کیفیت میں چلا جاتا تھا۔

"اچھا تو اس تیس سالہ نفرت کے پیچھے یہ راز چھپا تھا، وہ اپنے باپ کے خوف کی وجہ جان گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ اگر ان کا بیٹا گھوڑا ہوتا تو اسے گولی مارنا آسان ہوتا۔"

یہ معمہ اس طرح حل ہوا، دراصل اس کی کمر پر ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ دائیں طرف ایک گہرے سرخ رنگ کا دھبا تھا، بالکل ویسا جیسا باراک کے جسم پر تھا۔ اس نشان کو چھو کر ایک دفعہ اس کی گرل فرینڈ نے کہا تھا کہ "میں نے اس طرح کا نشان آج تک نہیں دیکھا، یہ تو بالکل خون کے دھبے کی طرح ہے"۔ اس کا بے بس باپ اس نشان کی وجہ سے خوف زدہ تھا جو اس نے اس کی پیدائش کے بعد یقیناً اس کی کمر پر دیکھا ہوگا۔

باراک وہ گھوڑا تھا جس نے اس کی ماں کو مار دیا تھا۔ اس نے اس کی ماں کا سر کچل کر اسے دریا میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے جسم

پر پایا جانے والا نشان باراک کی کمر کے نشان جیسا تھا۔ اس کا باپ اسی وجہ سے خوف زدہ تھا اور اسے کہتا تھا: ''اگر تم گھوڑے ہوتے میں گولی مار کر تمھارے سر کا بھیجا اڑا دیتا''۔ اتنی بے وقوفانہ کہانی اس کے ساتھ منسلک تھی۔ اس کہانی نے بہت سے لوگوں کی زندگیاں برباد کر دی ہوں گی۔ وہم کی ایک دیوار۔۔ جو تیس سال تک باپ اور بیٹے کے درمیان حائل رہی۔

''کاش! ابو محمد اس بل کھاتے ہوئے ڈوری نما خونی دھبے کی طبی وجہ جانتا ہوتا، کیوں کہ اس کا باپ نے۔۔۔''

''ابو محمد اور اس کے توہمات جیت گئیں، اس کا باپ ہار گیا۔ اتنی بھاری قیمت ادا کی، میرے باپ نے'' اس نے خود سے سوال کیا ''ایک بھورا یا لال دھبا کیوں ہوتا ہے انسانی جسم پر، اس کی وجہ تو ہم جانتے ہیں لیکن اس کی جگہ کا تعین نہیں کر سکتے، اور نہ ہی وجہ جان پاتے ہیں کہ یہ کسی خاص جگہ پر کیوں نمودار ہوتا ہے''

ابو محمد کا کہنا تھا کہ باراک نامی گھوڑے نے اس کی ماں کو کچل کر مار دیا تھا، جب کہ وہ ایک نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ اسے گھڑ سواری پر بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ پھر باراک نے اسے کیوں مار دیا؟۔ خاص طور پر اس کے سر کو کیوں کچل دیا؟ اور پھر اسے دریا میں پھینک دیا۔ کسی بھی وجہ کے بغیر۔ سارے کا سارا زور اس کی ماں کے قتل پر ہی کیوں تھا۔ ابو محمد واقعی جنگ جیت گیا اور اس کا قابلِ رحم باپ ہار گیا تھا:

''اب میرا باپ ایک اور جنگ لڑ رہا ہے، وہ بھی میرے ساتھ، اب ہم میں سے کون جیتے گا''۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

ایک اذیت ناک سوچ ایک دھماکے کی طرح اس کے ذہن میں گونجی۔

''میں نے ایک باتونی ڈاکٹر کو اپنے باپ کی سرجری پر لگا دیا، اس میں میری مرضی شامل تھی''۔

وہ دراصل اپنے باپ کے رویے سے دل برداشتہ تھا، اس کی لاپروائی اس کے باپ کی جان بھی لے سکتی تھی۔ اس کی ساری توجہ اس کی باتوں کی طرف تھی۔

''اگر ایسا ہے تو میں ہی قاتل ہوں اپنے باپ کا، میں نے یہ کیا کر دیا۔ میں پاگل ہوں؟''

ایک لمحے کے لیے وہ سکتے کی کیفیت میں چلا گیا، ہوش میں آتے ہی اس نے ہسپتال کی طرف دوڑ لگا دی۔

سورج اب طلوع ہو کر چاروں طرف روشنی پھیلا رہا تھا، اس کے بھاری قدم پتھریلی سڑک پر ایسے پڑ رہے تھے، جیسے تیزی سے بھاگتے ہوئے اچھلتے کودتے گھوڑوں کی قدموں کی آواز گونجتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حرص

نادیہ عنبر لودھی

اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کے ٹکڑے کو مٹھی میں سختی سے دبایا اور اسے چھپانے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے لگی۔ برسوں کی دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دینے کا اب کیا فائدہ۔ اس خط کو کہاں چھپاؤں اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سائیڈ ٹیبل کی ڈرا۔ نہیں یہ تو ہر کسی کی رسائی میں ہے۔

کپڑوں کی الماری۔ نہیں

وہاں سے تو بہو بیگم کے ہتھے چڑھ سکتا ہے۔

کہاں رکھوں؟ کیا کروں!

پھر وہ اسٹینڈ کے سہارے چلتی ہوئی واش روم میں گئی۔ خط اور لفافے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اس نے فلش میں بہا دیئے۔ پھر اس نے وضو کیا اور واپس نماز والی کرسی پر آ بیٹھی۔

وہ نماز پڑھنے لگی۔ نماز ختم ہوئی تو دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں سے اپنے والد کے لیے مغفرت اور جنت مانگنے لگی۔

اس کے آنسو گرنے لگے اور وہ رونے لگی۔

اتنے میں بہو کی آواز سنائی دی اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔ بہو کھانا لائی تھی۔ بہو نے ٹرے اس کے سامنے رکھی اور وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

بہو نے بغور ساس کے چہرے کی طرف دیکھا ساس اسے بہت نڈھال نظر آئی۔ ممی جی آپ ٹھیک تو ہیں۔ بہو بولی

جی بیٹا ''میں ٹھیک ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔

بہو خاموشی سے ٹرے اٹھا کر چل دی۔ وہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ اپنا لڑکپن اور پھر شادی پھر بڑھاپا۔

جوانی۔ مری جوانی۔ کہاں گئی۔ اس نے خود سے سوال کیا۔

کیا میں کبھی جوان نہیں تھی۔

وہ شادمانی کے دن مری زندگی کا حصہ نہیں تھے۔ اس نے دماغ پر زور دیا لیکن اسے کچھ یاد نہ آسکا کوئی مدھر بھری یاد ذہن کے دروازے پر دستک نہ دے سکی۔ شاید بڑھاپے سے مری یادداشت چلی گئی ہے۔

سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ معدوم چہرے خواب میں واضح ہونے لگے۔

ڈیڈ۔ ڈیڈ۔ ڈیڈ۔ ڈیڈ وہ دیوانہ وار باپ کو پکار رہی تھی لیکن باپ اس کی آواز سن نہیں رہا تھا پھر اسے اپنی ماں دکھائی دی۔

مما۔ مما۔ مما اس نے ماں کو پکارا ماں نے بھی سنی ان سنی کر دی۔

اسے اپنی بڑی بہن دکھائی دی

آپی۔ آپی۔ آپی۔ آپی

وہ پکارنے لگی۔ بہن کے کان پر بھی جوں تک نہ رینگی۔

پھر اسے چھوٹے دونوں بھائی نظر آئے۔ اس

نے بھائیوں کے نام لے کر بہت آوازیں دیں۔ وہ سب تیز تیز چلتے گئے وہ ان کے پیچھے دوڑتی پکارتی چلی گی بھاگتے بھاگتے وہ گر گئی اور اس کے گھٹنے چھل گئے۔ ہائے کے آواز اس کے منہ سے نکلی دونوں ہاتھوں سے گھٹنے پکڑے وہ زمین پر گری ہوئی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

اسے اپنے ہاتھوں تلے گھٹنوں کی ہڈیاں محسوس ہوئی تو اسے یاد آیا میں تو بوڑھی ہوں وہ تو خواب تھا

بند دروازوں کی اذیت پھر تازہ ہوگئی۔ پہلے فون پر رابطے بند ہوئے پھر دروازے بند ہوتے چلے گئے پھر راستے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ایک ایک کر کے سب بند ہوتے چلے گئے وہ دستک دیتی رہی لیکن سارے در دیواریں بن گئے اور اب تو اُس کے قدموں میں ہمت ہی نہیں رہی تھی بمشکل اپنا بوجھ اٹھا کر اسٹینڈ کے سہارے سے چلتی تھی۔

ایک خط سے سارے زخم کھل گئے۔ کیا کروں گی میں ان کروڑوں روپے کا۔ اس نے سوچا لباس خرید لوں۔ مگر بوڑھے وجود پر ہر لباس بدنما ہی لگے گا

مہنگی گاڑی خرید لوں۔ اب چلانے کی ہمت کہاں۔ اسے بچپن یاد آنے لگا جب وہ اپنے پاکٹ منی سے اپنے چھوٹے بھائیوں کے لیے کھلونے خریدا کرتی تھی۔

کب وہ بڑے ہوئے اور اس کے حصے کی ماں باپ کی شفقت کھا گئے

اسے پتا ہی نہ چلا۔ پھر وہ اس کے باپ کا کاروبار کھا گئے۔ والدین کے گھر کے دروازے اس پر بند ہوگئے وہ تو اس کے حصے کا سورج بھی کھا گئے۔ بھائی جن سے اسے بہت پیار تھا۔ ''دعا کرو اللہ میاں بھائی دے اللہ بچوں کی دعائیں سنتا ہے''

اس کی نانی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ جن کے لیے دعائیں کیں انھوں نے اسے والدین کی دعاوں سے ہی نکال دیا۔

''باری باری ساری جائیدادیں تمہارے بہن بھائیوں کے نام لکھی جا رہی ہیں۔ جاؤ جا کر اپنا حصہ مانگ کر لاؤ''۔ اس کے شوہر کی آواز گونجی۔ تمہارے بہن بھائی ساری جائیداد لے جائیں گے۔

حصہ لینے کا شوق لیے اس کا شوہر قبر میں چلا گیا۔ ارب پتی باپ کی بیٹی تھی اور ساری زندگی عسرت میں گزر گئی۔ چھوٹی چھوٹی ضروریات، معمولی خواہشات سب غربت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس کے بہن بھائی والد کی جائیداد کی بدولت عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔

اس نے حصہ مانگنے سے انکار کر دیا تو اس کے شوہر نے خود حصہ مانگ لیا اور اس طرح حصہ دینے والوں نے اُس پر سب دروازے بند کر دیئے۔

اسے خط کا متن یاد آنے لگا۔ 'ڈیڈ ہم میں نہیں رہے انھوں نے اپنی زیادہ تر جائیداد اپنی زندگی میں ہی بانٹ دی تھی بقیہ کے لیے عدالت میں کیس دائر کیا ہے آپا تم اپنے شناختی کارڈ کی کاپی اور پاور آف اٹارنی سائن کر کے بھیج دو۔''

☆☆☆☆☆

جغرافیے کی کتاب کا پہلا ورق

یہ دنیا قلزمِ ریگِ رواں ہے اور ہم اس بے کرانی میں ہوا
کی سیٹیاں ہیں موجۂ آوازِ صحرا ہیں
ہوا کے رُخ پر اُڑتی ریت کے ذرّے، دنوں کی دُھوپ
میں یُوں جگمگاتے ہیں کہ جیسے
جنگلوں کے نکھرے نکھرے آسمانوں پر مُسلسل سات
دِن کی اِک تواتر کشش،
ساون کی جھڑی رُکنے پہ،
بادل صاف ہونے پر کئی دن ____
رات بھر جگ مگ ستارے جھلملاتے ہیں
ہوا کے رُخ پر بہتی ریت کے ذرّے زمیں پر کہکشائیں
کھینچ لاتے ہیں
ہوا کے رُخ پر جانے کون اس بے آب دریا میں بگولوں
کے سفینے ڈال دیتا ہے سرابوں میں رواں،
چُپ چُپ چمکتی ____
رُخ بدلتی کشتیوں کے بادبانوں میں
ہوا یُوں پھڑ پھڑاتی ہے کہ جیسے
آرزوؤں کے پرندے مقبروں میں گنبدوں کے
دائرہ در دائرہ چنگال سے پَر مار کر،
یک بارگی آزاد ہونے کو،
مُسلسل پَر ہلاتے ہیں
ہوا کی باگ پر، کیا جانئے، کس کا تصرف ہے،
ہوا کا اپنا کوئی رُخ نہیں ہوتا، ہوا تو صرف چلتی ہے
یہ آنکھیں بھی ہوائے قلزمِ ریگِ رواں کے ساتھ
چلتا استعارا ہیں
یہ آنکھیں ___ موجۂ ریگِ رواں کے زور سے کٹتا
کنارا ہیں
یہ گھر آباد ہیں ___ بس اک تحیّر کی ہواؤں میں

خالد احمد

مزدور

کب تک ایک کریں گے خون پسینہ
کس کے لیے ہے آپ کا مرنا جینا

کس نے لوٹی آپ کی نیک کمائی
کس نے آپ کا چین آرام ہے چھینا

آپ نے مزدوری کی شان بڑھائی
آپ کے ہاتھ کا ہر اک زخم نگینہ

ہونٹوں پر فریاد کی بندش ، دولت
آنکھوں میں ہیں ٹھہرے اشک خزینہ

آپ نے مزدوری میں ظلم سہے ہیں
چھلنی چھلنی ہو گیا آپ کا سینہ

کتنے اچھے آپ ہیں پاکستانی
آپ کی عادت کا ہے پیار قرینہ

ثاقبؔ یہ مزدور ہیں عزت والے
ان کی دعا میں گزرے میرا شبینہ

آصف ثاقب

کوئی اُلجھن تمھارے بعد نہیں

کیا ہوا کیوں ہوا تھا، یاد نہیں
کوئی اُلجھن تمھارے بعد نہیں

کیوں ستاروں کی بھیڑ سے ہم کو
بختِ روشن کا گمشدہ تارا
اپنی صورت نہیں دکھاتا ہے!
کب سمندر ہماری کشتی کے
ٹوٹتے، گرتے بادبانوں کو
ساحلوں کی طرف گھماتا ہے!

کیوں نگاہوں میں پھیلتا صحرا
نقشِ منزل سے ماورا ہو کر
سانس لینے کو بھی نہیں رکتا!
اپنا ہی عکس دیکھنے کے لیے
آئنہ آئنہ سے پانی میں
چاند کیوں جھیل پر نہیں رکتا!

ہجر کی رات کیوں نہیں کٹتی؟
وصل کیوں برق پا گزرتا ہے؟
حل نہ ہوتے تھے جو سوال گئے
آرزو کے بدل گئے معنی
خواہشوں میں سمٹ گئیں خوشیاں
دل میں رہتے تھے جو ملال، گئے

اب کسی واقعے کے ہونے سے
کچھ بدلتا نہیں کہیں پر بھی
کوئی افسوس، کوئی داد نہیں
کیا ہوا، کیوں ہوا تھا یاد نہیں
کوئی اُلجھن تمھارے بعد نہیں

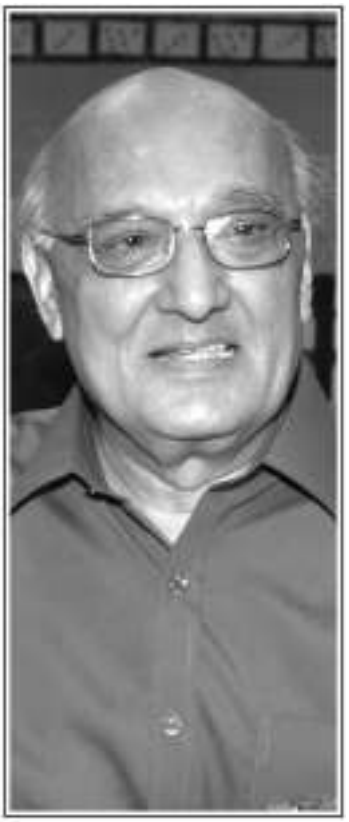

امجد اسلام امجد

بیادِ فراز

کھینچا تھا نقش گر نے اک نقش کیا بھلا سا
احمد فراز نامی شاعر وہ دل رُبا سا

آنکھیں خمار آگیں چہرہ کھلا کھلا سا
آواز میں تپک سی لہجہ وہ رس بھرا سا

شہزادۂ سخن تھا جانِ ہر انجمن تھا
بزمِ سخن وراں میں سب سے لگے جدا سا

سو معجزے سخن کے اُس کو عطا ہوئے تھے
تھا ہر سخن شناسا ان کے سخن کا پیاسا

جس بزم میں ہو بیٹھا لگتی سجی سجی سی
جب بھی غزل سنائے ہونے لگے نشا سا

ہر شعر اُس کا دل میں ہو جاتا تھا ترازو
سونا تھے شعر اُس کے سونا بھی اصل پا سا

کب سے بنا ہوا تھا لاکھوں دلوں کی دھڑکن
ہر ایک خوش ادا کا لگتا تھا وہ شناسا

کچھ اور بھی سخن ور ہیں باکمال لیکن
احمد فراز ہی تھا احمد فراز کا سا

بکھرائے بال اپنے گریہ کناں غزل ہے
ملنے کا اب نہیں یہ شاعر فراز آسا

روتی رہے گی اس کو صنفِ غزل ہمیشہ
یہ دکھ بہت بڑا ہے، یہ دکھ نہیں ذرا سا

توصیف مجھ سے کیا ہو جانِ سکون اُس کی
وہ چاند تھا سخن کا میں ہوں فقط دیا سا

جب بھی وہ یاد آئے دل دکھ میں ڈوب جائے
کچھ بھی سمجھ نہ آئے کیا دل کو دوں دلاسا

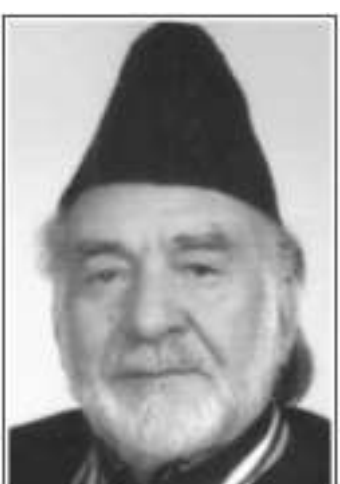

سلطان سکون

ڈیم

گلزار بخاری

اگر آبی ذخیرے جا بجا ہوتے
وسائل کی بقا ہوتے
کوئی پانی کا ریلا
سیل یا طوفان کیوں بنتا
زمینوں کے لیے نقصان کیوں بنتا
مویشی اور بندے
ڈوب کر مرتے نہ لہروں میں
پریشاں اس قدر
ہر سوچ کا انسان کیوں بنتا
ہزاروں ڈیم پبلک کی مدد سے
رات دن تعمیر ہوتے ہیں
طلاطم کے لیے نا قابلِ تسخیر ہوتے ہیں
کمی بجلی کی پیش آتی
نہ کوئی کارخانہ
بندشوں کا سامنا کرتا
تھپیڑے آزمائش کے
مسلسل ارتقا ہوتے
اگر آبی ذخیرے جا بجا ہوتے

قیامت

ڈوب گئے کیا چاند ستارے پانی میں
ہم سب کی آنکھوں کے تارے پانی میں

جو بن پر تھے موت کے دھارے پانی میں
ڈھونڈ رہے تھے لوگ سہارے پانی میں

دریاؤں سے آگ کی لپٹیں آتی تھیں
موت نے رکھے تھے انگارے پانی میں

ٹوٹی ناؤ، پھول سے بچے ہاتھوں میں
ڈوب گئے پھر سارے منظر پانی میں

ابو، امی، بھائی، بہنا اور خدا
ڈوبنے والا کس کو پکارے پانی میں؟

پانی کا ہر اک قطرہ زہریلا تھا
کرتی تھی بس موت اشارے پانی میں

پھر منجدھار میں کشتی اُلٹی، ڈوب گئے
گھر ناؤ کے کھیون ہارے پانی میں

پوچھ رہی ہیں کتنی مائیں لوگوں سے
کیوں سوئے ہیں لعل ہمارے پانی میں؟

پاگل ہو کر بہنیں بیٹھی راہوں پر
ڈوبے جن کے بھائی پیارے پانی میں

ڈھونڈ رہے ہیں پھول سے پیکر بچوں کو
اب بھی سورج کے لشکارے پانی میں

پاکستان کی ہر اک آنکھ میں آنسو ہیں
ڈوب رہے ہیں لوگ بھی سارے پانی میں

جو زندہ ہیں اب ہیں مُردہ جسم لیے
اِن کی میت کون اتارے پانی میں؟

جیتنے والے ہر بازی کو آج عقیل
اپنی جان کی بازی ہارے پانی میں

عقیل رحمانی

کیم لُو پس کے لیے ایک نظم

ننھی ننھی سی قبروں کی تہہ داریاں
گرد میں کون ترتیب ڈھونڈے بھلا!
نظم کی رمز آثار سطریں
وہ معصوم، ناخواندہ آنکھیں
تمدن کی ٹاپوں سے کچلی گئیں
شمعیں بجھتی گئیں
خواب کی چھانی میں پروئے پرندوں کے پَر اُڑ گئے تھے
رنگ روتی وہ چوبی شبیہیں وہیں بستیوں
کے کنارے سجی رہ گئیں
مائیں، شامِ الم،
دید کس رُخ پہ رکھتیں
کہ کچے گھروں میں نہ کھڑکی کوئی تھی
نہ دہلیز تھی
کچھ اگر تھا تو بس آس تھی
خالی منظر میں اُرتی ہوئی راکھ تھی
دُور---انجان وحشت کی دیوار
بے نام چیخوں سے اونچی تھی
اور ضبطِ تعلیم ہوتا گیا
زخم آموختہ آہ میں ڈھل کے بجھتے گئے
بھیگی پلکوں پہ ٹھہرا ہُوا اشک،
اشکوں میں تقسیم ہوتا گیا
پھر ثقافت کُشی سے بھڑکتی ہوئی روشنی تیز تر ہوگئی
ڈر کے اوراق ازبر ہوئے
اور یوں
دھول کی گرہیں کُھلنے میں مدت لگی
وقت جاگا--- مگر دیر سے
مدرسہ اتنا پختہ تھا
پہنچی ساعت تلک وہ خبر دیر سے
کچھ دعاؤں میں گھلتا ہے شاید---اثر دیر سے

حامد یزدانی

کیم لُو پس: کینیڈا کے صوبہ برٹش کولمبیا کا وہ شہر جہاں اوّل اوّل سیکڑوں بے نام قبروں کے نشانات ملے۔ ان بے نام قبروں میں شمالی امریکا کے قدیمی یا مقامی باشندوں کے ان بچوں کی تدفین کی گئی تھی جنھیں کلیسا کی اجازت سے نوآبادیاتی یورپی حکمرانوں نے لاکھوں دیگر مقامی بچوں کے ساتھ جبری طور پر رہائشی سکولوں میں بھرتی کیا تھا۔ جہاں ان کی مناسب نگہداشت نہ کی گئی اور تہذیب وتمدن کی تعلیم کی آڑ میں انھیں ان کے اہلِ خانہ، آزادی اور ثقافت سب سے دُور اور محروم کر دیا۔

روتا بچہ

مرے رستے میں بھی آیا ہے اکثر
روتا بچہ
امی امی
امی جی کہتا
کسی بھی راہ پر بدحال
بہتی ناک، ننگے پاؤں
انجانی کسی لمبی ڈگر پر
پاؤں کی ایڑی رگڑتا
بے اماں بچہ
یہ سوچ آتی ہے
گاڑی روک کر
اس کھوئے بچے کی
سلگتی، آنسوؤں سے تر ہتھیلی تھام لوں
اس کی لکیروں میں تلاشوں
اس کے آدم اور حوا کو
بھگتنا پڑ رہا ہے
جن کی کوتاہی کا خمیازہ
سسکتی ننھی سی جاں کو
مگر گاڑی نہیں رکتی
انہی خدشات کی رو میں
کچھ آگے دور تک
میں دیر تک یہ سوچتی ہوں
ایسا کرنے سے
پولیس، تھانے کچہری کی کسی گھمبیر
الجھن میں
الجھ کر رہ نہ جاؤں ۔

رخشندہ نوید

تم کہاں تھے؟ [حالیہ سیلاب کے تناظر میں ایک نظم]

سنو ریاست کے شہنشاہو--اے خیر خواہو!!
ہمارے بچوں کی سرد لاشیں، گھروں کا ملبہ، بھنور میں ڈوبی ہوئی وہ چیخیں، اُجاڑ کھیتوں سے اگتے نوحے
تمہارا پُرسہ ضرور لیں گے
ضرور لیں گے----- مگر سماعت کا حوصلہ ہے تو پھر بتاؤ
جب ایک طوفاں ہماری دھرتی، ہمارے گاؤں
ہمارے کچے مکاں کی مٹی نگل رہا تھا---- تو تم کہاں تھے؟
بغیر دستک جب اک قیامت ہمارے سر پر کھڑی ہوئی تھی--- تمہیں تو اپنی پڑی ہوئی تھی--- کہ تم کہاں تھے؟
کہاں تھے تم جب
چہار جانب بپھرتا دریا گھروں کو ملبہ بنا رہا تھا۔
کہ ریلہ ریلہ اُچھلتا پانی یہاں قیامت اُٹھا رہا تھا---- تو تم کہاں تھے؟
نڈھال ماتم کناں وہ بوڑھا گزرتی موجوں کو اپنے لختِ جگر کا نوحہ سُنا رہا تھا---

کسی کی بیٹی کے عمر بھر کا جہیز دریا میں جا رہا تھا
تو تم کہاں تھے؟
تو آؤ پُرسہ وصولتے ہیں
نحیف بوڑھے کہ جن کو پانی میں دفن بچے
نہیں ملے ہیں
بپھرتے دریا کی تُند موجوں پہ فاتحہ پڑھ کے آ چکے ہیں
گھروں کے ملبے پہ بیٹھے کب سے
یہ سوچتے ہیں کہ تم کہاں تھے
انہیں بتاؤ کہ تم نہیں تھے!!!

عاطف جاوید عاطف

مٹی، پانی اور خواب

بے بسی کی تاریخ
جب کبھی اپنا نوحہ لکھے گی
زندگی کی لکیر
روشنی سے اگر چمکے گی
رات کا بانکپن
سفید لمحوں کی سرشاری سے تجاوز کرے گا
عشق کا شاہ زادہ
گلاب چہروں کی بے نیازی سے ہمکتا
جنگلی پرندوں کو محبت کرنا سکھائے گا
تب ظلم کی دیرینہ روایت کا طلسم ٹوٹے گا

وحشت کے کربناک موسم میں
پانیوں سے بہکی ہوئی خزاں
غفلت سے ڈوبتے مکانوں کی مٹی سبز
کرے گی
ہمارے اطراف، پتھروں کے پہاڑ
خاموشی کا ترانہ ایجاد کریں گے

کیا محروم افراد کے لیے
موت کے سبھی آپشن' زمینی سگنل کھلے ہیں؟

کہیں حرص کے دھبوں میں
ایمان کا شائبہ تو نہیں
کہیں سیاسی آوازوں کے جادو سے
فضا کا رنگ گندمی نہ ہو جائے
کہیں انسانیت کے نام پہ جلنے والے
چراغوں کی لو مدھم نہ پڑ جائے
کہیں آسمانوں کی خاموشی میں رہنے والا خدا
ناراض نہ ہو جائے

امجد بابر

نثری نظم

بہت مدت تک ساتھ رہیں تو لگتا ہے

محبت ہے
مگر وہ محبت نہیں ہوتی

بہت مدت ساتھ رہنے سے
اک دوسرے کی عادت سی ہو جاتی ہے
کوئی آنکھوں سے اوجھل ہو تو لگتا ہے

کمی سی ہے
کمی لیکن نہیں ہوتی
فقط عادت ہی ہوتی ہے

اور
پرانی عادتیں کب اتنی آسانی سے چھٹتی ہیں

انہیں تو چھوڑنے میں زمانے لگتے ہیں
مگر جب چھٹتی ہیں تو ایسی چھٹتی ہیں
دوبارہ منہ نہیں لگتیں
جسے تم محبت سمجھتے تھے
وہ بھی فقط اک دوسرے کے ساتھ کی عادت ہی تو تھی
عادت کو محبت بنانا تمہیں نہیں آیا
جب میں نے تمہاری عادت چھوڑ دی تو
پھر پلٹ کر نہیں دیکھا

نائلہ راٹھور

دعا

تو اگر مجھ سے خفا ہو جائے
زندگی کرب و بلا ہو جائے

میرے سب کام سنورتے جائیں
تیری شامل جو رضا ہو جائے

تیری دنیا کا نہیں میں طالب
مجھ کو بس تو ہی عطا ہو جائے

صدقہ آل محمدؐ یا رب
میری مقبول دعا ہو جائے

تیری رحمت کی نظر ہو جس پر
اس کے آنگن میں ضیا ہو جائے

جب ترا نام زباں پر آئے
دل مرا نغمہ سرا ہو جائے

اپنے دانش پہ کرم کر مولا
شادماں روز جزا ہو جائے

اعجاز دانش

جِند

میں تری آرزو کی بانہوں میں
ہر گھڑی یوں مچلتی جاتی ہوں

جیسے عاشق کسی وصال کی شب
اپنے محبوب کی اداؤں سے
زندگی کے دیے جلاتا ہے

جیسے بادِ صبا سے پھول کوئی
لہلہاتا ہے مسکراتا ہے
زندگی کا سراغ پاتا ہے

جیسے شاعر کا ایک خوابِ حسیں
چشمِ حیرت کے ریگزاروں میں
سبزہ زاروں کے گیت گاتا ہے

اے مری جان! جانِ رخسانہ
دن بھی تم سے ہے، رات تم سے ہے
میری ساری حیات تم سے ہے

رخسانہ سمن

سیلاب کے بعد

معروف فرانسیسی شاعر: ''آرتھر راں بو'' کی نظم "After the Flood" کا اُردو ترجمہ
(1891-1854)Arthur_Rimbaud

جیسے ہی سیلاب کا خوف چھٹ گیا،
ایک خرگوش سہ شاخے اور سوسن کے پھولوں میں آ پھنسا،
جس نے تارِ عنکبوت سے لڑکھڑاتے ہوئے خدا کو قوسِ قزح کا وعدہ یاد دلایا

آہ! کیا گوہر دفن ہیں،
کیا پھول ہیں جو پہلے سے مرجھائے ہوئے ہیں

ایک آلودہ گلی میں انھوں نے اپنی دکانوں پر نشانات لگائے تھے،
اور کشتیوں کو گھسیٹ کر اوپر سمندر کے پاس یوں لے گئے جیسے وہاں کندہ کی گئی ہوں

بلیو بیئرڈ کیسل میں خون بہہ رہا تھا۔۔۔
مذبح خانوں میں، سرکسوں میں، خدا کے اپنے گھر میں
کھڑکیوں پر پیلاہٹ تھی، خون اور دودھ بہہ رہا تھا
مزدور عمارت بنا رہے تھے؛ چھوٹے کیفے میں کافی کے گلاسوں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی

بڑے گھر کی کھڑکیاں ابھی تک شیشوں سے محروم ہیں
سوگوار بچے اپنی شاندار تصویری کتابوں کو دیکھ رہے ہیں
گاؤں کے ایک چوک میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا، ایک بچے نے اپنے بازو ہلائے،
ہر جگہ ہوائی چکیاں اور بادنما بنائے جا رہے ہیں
بارش کی رم جھم کے نیچے

میڈم ایکس نے ایلپس پر ایک پیانو رکھ لیا ہے
پہلی شراکت داری کی تقریبات

کیتھڈرل کی ایک لاکھ قربان گاہوں پر ادائیگی ہو چکی ہے

برف کی افراتفری اور قطبی
رات میں قافلے روانہ ہو چکے تو،
شاندار سرائے تعمیر کر دیئے گئے

جب سے چاند نے گیدڑوں کی آوزیں سنی ہیں،
پودینے سے بھرے صحرا میں نوحہ خوانی ہوئی،
لکڑی پر نظمیں کندہ کی گئیں
باغ میں جُھنڈ۔ پھر بنفشی پھیلتے ہوئے باغ کے اندر،
یوکریس (کے مقدس) پودے نے مجھے بتایا کہ یہ بہار ہے

پُل کے اوپر اور جنگل میں سے
تالاب کی جھاگ کی مانند کھلنا اور پھر مرجھا جانا

سیاہ موت اور آرگن کی موسیقی، بجلی اور گرج میں.....
سیلاب کا چڑھنا؛
پانی اور اُداسی، اُٹھو اور سیلاب کو بڑھاؤ!

جب وہ آگے بڑھا اور اُس نے سب ملیامیٹ کر دیا.....

اے ڈوبے ہوئے نگینو!
اے بکھرے ہوئے پھولو!.....

کیا عذاب ہے!
اور ملکہ، جو مٹی کے برتن میں آگ جلاتی ہے،
ہمیں کبھی نہیں بتائے گی کہ وہ کیا جانتی ہے،
اور ہم کچھ نہیں جانتے

مترجم: عدیل عباس عادل

انہدام

دل سنبھالوں تو آنکھ گرتی ہے
آنکھ جوڑوں تو سر چٹختا ہے
سر پکڑتا ہوں دھڑ سمیٹتا ہے
میرے اعصاب جس نے جوڑے تھے
اپنی باتوں سے مجھ کو توڑ گیا
کیسے کیسے وہ حرف بول گیا

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لیے پھرتا تھا جو در در مجھ کو
بھول سکتا ہے وہ کیونکر مجھ کو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

خطوط

نسیم سحر

برادرم عمران منظور۔

بیاض کا تازہ شمارہ موصول ہوتے ہی دل دکھا اور رنج سے بھر گیا کہ اس کے سرورق پر دو بہت پیارے دوستوں، بہت اچھے ادیبوں، اختر شمار اور قائم نقوی کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جو گذشتہ ماہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے، شاہدہ دلاور شاہ اور فیصل زمان چشتی کے اختر شمار پر مضامین اور قائم نقوی پر اعجاز رضوی کا مضمون (مرحومین) کے بہت سے مثبت پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان دونوں سے ان کے تادمِ آخر رابطہ رہا ہے، دونوں ہی نفیس انسان تھے۔

آپ اور بیاض کی مجلسِ ادارت کے تمام اراکین کو یومِ دفاع کی مبارکباد۔ آج کا دن ہر سال بڑے عزم لے کر آتا ہے مگر اس سال تمام سٹیک ہولڈرز کی توجہ یومِ دفاع پر نہیں بلکہ کسی 'ایک' سمت پر الزام تراشی اور لفظی و میڈیائی فائرنگ کی جانب ہے، اس لیے تو ابھی پرسوں دہشت پسندوں کے ایک حملے میں ایک فوجی افسر اور چھ سپاہی شہید ہو گئے تو سوال اٹھنے لگا کہ کیا ہماری افواج ملک کے اندرونی اور بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لیے آہنی دیوار کا کردار ادا کر رہی ہیں؟ ایسی وارداتیں ملک کے کچھ علاقوں میں روز ہی ہوتی ہیں تو کیا یہ ہمارے معاسکر کے لیے لمحۂ فکریہ نہیں؟ شاید انھیں اپنی ترجیحات بدلنے کی ضرورت ہے۔

جناب کلیم خارجی اس مرتبہ ایک چونکا دینے عنوان ''ممتاز ادیبوں کے ذاتی خطوط'' سے جو تحریر لائے ہیں وہ پڑھ کر میں پہلے تو سوچتا ہی رہ گیا کہ واقعی یہ ممتاز عالم چوڑ کانوی اور ڈاکٹر فاضل میواتی کی اصل خط و کتابت ہے مگر غور سے پڑھا تو یہ ایک افسانہ یا فکاہیہ لگا۔ ظاہر ہے کلیم خارجی سینئر ادیب ہیں، اور سینئر ادیب شیر بن کر چاہے ماس کھائیں یا گھاس، ان کی مرضی۔ بس یہ کہ وہ ہر انداز میں اپنے قاری کی توجہ اپنی جانب رکھتے ہیں۔ جناب جام سجاد حسین کا مضمون ''عورت کا استحصال'' مشرق اور مغرب میں عورت کی آزادی کی وہ حقیقی تصویر پیش کرتا ہے جسے مغربی ممالک اپنے ''زورِ بیان'' سے غلط ثابت کرتا ہے۔ ان کا یہ نصیحت آموز اختتامی جملہ بھی سوچ کے دروا کرتا ہے کہ ''مغربی معاشروں کو مشرقی معاشروں سے خواتین کی عزت و حرمت بارے ضرور سیکھنا چاہیے اور بالکل اسی طرح مشرقی معاشروں کو مغربی معاشروں سے خواتین کی ترقی کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرنے کے متعلق سیکھنا چاہیے۔

خطوط کا حصہ اس بار نسبتاً مختصر ہے، جناب طالب انصاری نے میرے سابقہ خط کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے بین السطور مراسلہ نگاروں کی بے توجہی کا گلہ کیا ہے، اور آگے ان کا یہ جملہ پڑھ کر مجھے مزید حیرت ہوئی کہ ''میرا خیال ہے انہیں میرا شمار ان مراسلہ نگاروں میں نہیں کرنا چاہیے''۔ حضور، یہ تاب یہ مجال یہ طاقت کہاں مجھے، میرا تو ادھر خیال ہی نہیں گیا تھا۔ ویسے ان کے خط کا زیادہ تر حصہ غالب کا یہ مصرعہ یاد دلا گیا کہ ''خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو''۔ دوستوں کی شاعری میں کسی خامی پر وہ براہ راست بھی رابطہ کر سکتے ہیں نہ کہ خط کے ذریعے ہی انہیں گرفت میں لایا جائے۔ ورنہ پھر (ایک اور جریدے میں) خط بنام جمیل یوسف، اور خط بنام طالب انصاری جیسی چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ میرے انتہائی قابلِ احترام 'بزرگ تر' دوست (کہ بزرگ تو میں بھی ہوں!)۔ جناب جمیل یوسف اس مرتبہ حصہ خطوط میں تو موجود ہیں مگر ان کی کوئی تخلیق شمارے میں شامل نہیں۔

صاحبِ طرز فقار جناب سلیمان عبداللہ ڈار کا ''آپ کیوں روئے'' کے عنوان سے پورا مضمون ہی ایک نثری نعتیہ نظم محسوس ہوتی ہے اور حضورؐ انور کی سیرت و کردار کے بہت سے پہلو بیان کر کے ہمیں بھی ترغیب دے رہا ہے کہ حتی المقدور ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔

خالد احمد (مرحوم) کے شخصیت و فن پر جناب منظر حسین اختر کے مضمون سے معلوم ہوا کہ خالد احمد پر برادرم نعمان منظور کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ مقامِ تحسین ہے کہ ایک بڑے ادیب کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

افسانے بھی پڑھے ہیں، جناب ابدال بیلا کی کیا تعریف کی جائے، بس پڑھتا رہا اور عش عش (یا اَش اَش؟) کرتا رہا، جادوگر ہے یہ

شخص۔ محمد افتخار شفیع کا افسانہ "جذبات سے عاری آدمی" سیلاب زدہ بستیوں اور انسانوں کی کہانی ہے، اور ان دنوں یہی کہانی دیکھی بھی جا رہی ہے اور یقیناً ان بدقسمت انسانوں کی فہرست بن رہی ہے جو ان شدید اقترحات میں بھی جذبات سے عاری اور بے حسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ نور کمال شاہ کا افسانہ "دادا جان" بہت ہی پُر اثر تھا اور جنریشن گیپ کی صحیح ترجمانی کرتا ہے، اس پر مجھے دادا جان تو نہیں، "ابا جان" پر کہا ہوا اپنا ایک شعر یاد آ گیا:

بچے تمام کمروں پہ قابض ہوئے تو کیا!
گھر میں مرے لئے کوئی کونا تو ہے ہی نا!

حمد و نعت کے حصے میں یہ اشعار زیادہ اچھے لگے:

نہیں پاتی جو مجھ پہ یاس غلبہ	سراسر یہ ترا فضل و کرم ہے	ضیاء الدین نعیم
پیار ستر ماؤں کا ، شانِ کریمی ، رحمتیں	بے سہاروں کے لیے کیا کیا سہارے رکھ دیے	اکرم سحر فارانی
نہیں ہے کاسۂ درویش میں کچھ اس کے سوا	بس ایک نعت کی تازہ کتاب اور گلاب	تابش کمال
ذہن میں نعت کا مصرعہ اترا	ہو گئی صبح سہانی میری	سرور حسین نقشبندی

کچھ غزلوں کے چیدہ شعر بھی متعلقہ شاعروں کی داد کی غرض سے پیشِ خدمت ہیں:

تارے بھی ہمیں راہ سجھانے سے ہیں قاصر	ہم لوگ عجب دشت نوردانِ انا ہیں	
یہ شہر کے باسی ہیں کہ اڑتے ہوئے پتے	یہ شہر کے حاکم ہیں کہ جنگل کی ہوا ہیں	خالد احمد
اک اشک نے تن بیچ عجب آگ لگائی	اک آگ نے دل باغ کو جلنے سے بچایا	جلیل عالی
اس نے یہ دیکھ کے بخشا ہے رفاقت کا شرف	آدمی بندۂ تسلیم و رضا ہے کہ نہیں	انور شعور
کہاں کو جانا ہے معلوم ہے یہ قصر تو	کہاں کو جانا ہے وہ وقت پہ بتا دے گا	خاور اعجاز
اسے تقدیر کا لکھا کہا جائے تو بہتر ہے	ہر اک دکھ نے اچھالا ہے ہمارے عہد کا موسم	اقبال سروبہ
خود کو استاد کہتے ہو اور	شعر میں جھول اے مرے دوست	راحت سرحدی
عشق تکمیل تک نہیں پہنچا	ہم ادھوری بیاض رکھتے ہیں	خالد معین
وہ ہونٹ ابھی پھول بنانے میں مگن ہیں	ظاہر نہ کرو اپنا ارادہ، مری رادھا	افتخار شاہد
اس کو وفورِ شوق نے مارا کہ بھوک نے	کچھ پوچھتی ہے پھول پہ تتلی مری ہوئی	عبدالقادر تاباں
چیخیں بھی مچی گریہ تھیں مسلسل	در و دیوار پہ ماتم بپا تھا	نذر عابد
اب اپنے رفتگاں سے کہاں ملنے جائیں ہم	یا رب، ہمارے شہر قبرستان بہہ گئے	شاہد ماکلی
سیلاب پر لکھی ہوئی نظمیں چھلک پڑیں	سطریں الٹ پلٹ گئیں، عنوان بہہ گئے	شاہد ماکلی
میں ایسی آنکھوں کو زندہ شمار کیسے کروں	کہ جن کو پھولوں کا کھلنا نظر نہیں آتا	ثمینہ سید
ہر کہانی کا یہی انجام ہے	اک جدائی ہر کہانی کا ملال	شبہ طراز
عقل حیران ہے اس ذوقِ ہنر مندی کا	جس جگہ ہوتا نہیں ہے وہ وہاں ہوتا ہے	علی رضا بلوچ
جن کو سبق دیا تھا پڑھانے لگے ہمیں	دو اور دو کی جمع بتانے لگے ہمیں	سرفراز عارض
یہ معجزے بھی اچھے دنوں میں ہوتے ہیں	برے دنوں میں کوئی مہرباں نہیں ہوتا	عمر فیاض قائل
ازل سے ساتھ ہیں میرے ملال کے موسم	مرا حسب ہے اداسی، نسب اداسی ہے	نائلہ راٹھور
ایک درویش کی بددعا کیا لگی	شہر کا شہر ہی زخمی ہو گیا	گل جہان
ایک جگنو کی شہادت سے مجھے علم ہوا	رات ہر حال میں ظلمت کی قبا چاہتی ہے	قمروش عاطر عظیمی
کتنے ہی سانپ اس میں بسیرا کیے رہے	دیکھو کشادگی تو ذرا آستین کی	شفیق حیات شفق
جتنا جاگا ، جاگ لیا	اب میں سونا چاہتا ہوں	اعجاز رضوی
جلتے جاتے پرندوں پہ بدحواسی ہے	میں اس زمیں کا کہیں آخری شجر تو نہیں	قمر عباس قمر
اگر یہ حال ہے دروازے اور دریچوں کا	کتاب پر تو بہت دھول جم گئی ہوگی	زہرا اقرار

کوئی بھی وقت ہو چلتی ہے وہ دکان اپنی　　　　عیب کیسا ہے چھپے نوٹ کا بھی چل جانا　　　　زہرا قرار

جناب امجد اسلام امجد، گلزار بخاری، طلعت شبیر، راجہ عبدالقیوم اور رضیہ رشید کی نظمیں اپنا بھرپور تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہیں جبکہ ڈاکٹر دانش عزیز کی نظم "ملاقات" میں محبوب کا سراپا اور جذبۂ عشق کی عکاسی بڑے تخلیقی انداز میں ہوئی ہے، کچھ الفاظ اور تراکیب و علامت سے مجھے محسوس ہوا کہ شاید یہ نظم نعتیہ نظم بھی ہو سکتی تھی۔

خط کو تمام کرتے ہوئے "سافٹ ریمائنڈر" کے طور پر عرض ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والے نوجوان شاعر احمد محسود پر میرا مختصر سا مضمون اشاعت کے لیے آپ کے کرم کا منتظر ہے۔ سلامت رہیے، اور دعاؤں میں یاد رکھیے۔　　　　خیرا عدلیش

طالب انصاری

برادرم عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

خدا کرے آپ بعافیت ہوں اور بعافیت رہیں۔

"بیاض" کا شمارہ بابت ستمبر 2022ء موصول ہوا۔ اس عنایت پر دل جذبات امتنان سے بھرا ہے۔ ڈاکٹر اختر شمار اور قائم نقوی بھی داربقا کو سدھارے۔ آپ کی ادارت کی تحسین کی جانی چاہیے کہ ستمبر کے "بیاض" کے سرورق کو ان دو (مرحومین) کی تصاویر سے مزین کیا۔ ڈاکٹر اختر شمار پر لکھے گئے مضامین میں شاہد دلاور شاہ صاحب نے (مرحوم) کی زندگی اور فن پر خوب خامہ فرسائی کی۔ میرے لیے یہ بات باعث تعجب ہے کہ ان کی وفات کے بعد وہ چند احباب اور اپنے بیٹے کے خواب میں آئے اور کہا کہ وہ چکری میاں کے قبرستان میں خوش نہیں ہیں۔ انھیں ہری پور میں ان کے پیر و مرشد کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ لہٰذا قبر کشائی کر کے ان کو ہری پور میں دوبارہ دفنایا گیا۔ کائناتی نظام میں ابھی بہت سے راز ایسے ہیں جن کی گرہ کشائی شاید انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔"

قائم نقوی صاحب سے تو میرے دوستانہ تعلقات رہے۔ جب ان کی صحت اچھی تھی تو وہ متعدد بار واہ کی ادبی تقاریب میں شریک ہوئے۔ اعجاز رضوی صاحب نے قائم نقوی کے ساتھ اپنے تعلقات اور (مرحوم) کی شخصیت کے چند گوشوں پر مختصر مگر قابل تعریف مضمون قلم بند کیا۔ ڈاکٹر اختر شمار سے اگرچہ میرے دوستانہ مراسم نہیں تھے، تاہم ادبی رسائل میں ان سے ملاقات رہا کرتی تھی اور میں ان کے شعری وفور کا معترف رہا ہوں۔ یہاں ادبستان واہ کے ایک ہند چراغ علی مظہر کا شعر بھی چل ہے۔

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار

دیگر مضامین بھی لائق مطالعہ تھے۔ رسالہ کی اکلوتی آپ بیتی "شاہ و داستان" از سید شوکت شاہ سیاسی و انتظامی اکھاڑ پچھاڑ کی چشم کشا داستان ہے اور سلیمان عبداللہ ڈار کا تصوف پر مبنی مضمون بھی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔

حصہ حمد و نعت میں اکرم سحر فارانی کی حمد تازہ کاری سے مملو تھی۔ درج ذیل شعر میں ان کا شاعرانہ کمال خوب جھلکتا ہے۔

اس نے جب چاہا زمیں کو بخش دیں ہریالیاں　　　　اور جب چاہا کبھی منظر اتارے، رکھ دیے

تابش کمال کی نعت میں منفرد ردیف نے خوب لطف دیا۔ اور تخلیق کار نے ردیف کو بہت عمدہ نبھایا۔ اسی طرح تسنیم سحر اور محمد یٰسین قمر کی نعت بھی تازگی سے بھرپور تھیں۔ ابدال بیلا افسانوں میں نئی طرز کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کے افسانے الگ بُنت کی وجہ سے پسند آتے ہیں۔ "بیاض" کا شعری حصہ سب اصناف پر بھاری ہوتا ہے۔ شاعری کا گویا ایک چمنستان کھلا ہوتا ہے۔ اس چمنستان سے بہترین رنگ و بُو والے چار پھول دکھا کے اجازت چاہتا ہوں:

اس نے یہ دیکھ کے بخشا ہے رفاقت کا سفر　　　　آدمی بندۂ تسلیم و رضا ہے کہ نہیں　　　　انور شعور

سوئے ہوئے تھے ہم کہ تلاطم نے آ لیا　　　　چپّو ہمارے نیند کے دوران بہہ گئے　　　　شاہد ماکلی

اب مِرے زخم کا سامان کیا ہے جاذب　　　　تب کہیں پہلا مِرا گھاؤ بھرا اندر سے　　　　اکرم جاذب

خلا میں گھورتا رہتا ہوں رات دن باقیؔ　　　　کہ جیسے میرا ستارہ یہیں سے گزرے گا　　　　باقی احمد پوری

احباب بیاض کی خدمت میں سلام۔

فرخندہ شمیم

ستمبر کا بیاض ملا۔ سرورق پر عزیزان اردو ادب کی دو بڑی ہستیوں کے احساس فرقت نے پلکیں نم کر دیں۔ جناب قائم نقوی اور جناب اختر شمار:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اللہ تعالیٰ ان کو رفعتیں عطا فرمائے۔ آمین۔

زیر نظر شمارے میں بالخصوص اوج تصوف پر ایک پر اثر تاثیر انگیز اور کیفیات کا سچا عکاس مضمون ''آپ کیوں روئے'' پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ جبکہ مضمون کا آخری جملہ فرط جذبات سے نم بچھا گیا کہ:

''میرے آقا میں ایک غریب الدیار شخص ہوں ایک مسکین اور قلاش آدمی ہوں مگر جس دن سے پتہ چلا کہ میرے آقا میرے لیے روئے، میں مسکین سے سلطان بن گیا۔'' سبحان اللہ

''بیاض'' کا حصہ نعت اور مضامین عموماً قابل داد ہوتا ہے، سو اس مار بھی ہے۔

فکشن کی ذیل میں حمزہ حسن شیخ کا ترجمہ قسمت والی کے عنوان سے پڑھنے کو ملا، اصل کہانی جتنی چست ہے ترجمہ اتنا تیکھا نہیں لگا۔

ابدال بیلا کی کہانی نیلا لفافہ ان کے اپنے مخصوص اسلوب کا بیانیہ ہے۔ فاضل افسانہ نگار اپنی ہی طبع زاد تحریروں کے حوالہ جات، ان پر ہونے والے تراجم کا ذکر، اور داد و تحسین کی پیرایہ کاری کے لیے عمدگی کے ساتھ جواز ڈھونڈ ہی لیتے ہیں، تاہم ایسے میں اسلوب میں احتیاط ضروری ہوتی ہے ورنہ مسلسل ستائش خود پڑھنے والوں کو کھٹک بھی سکتی ہے۔

غزلیں اور خطوط کے حصے بھرپور ہے۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

ستمبر کا شمارہ ملا، غزل و نظم اور نثر کا حصہ حسب معمول خوب ہے۔ شاعری کے علاوہ افسانوں اور مضامین کا اچھا انتخاب کیا گیا ہے۔

آغاز میں جناب خالد احمد کا نظمیہ کلام ''مقام'' ایک فکریہ نظم ہے۔ معاشرے میں منافقانہ رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

آیا جو منہ میں جس کے : مرے منہ پہ کہہ گیا
کچھ حیثیت مری ، نہ مرا کچھ وقار تھا
پھر یہ غبار کیوں پس اظہار رہ گیا

نسیم سحر کی نعت کا یہ شعر دیکھیے:

لکھے جا رہی ہے درود و سلام
نسیم سحر ، چشم نم بے حساب

مختلف غزلوں کے درج ذیل اشعار خوب لکھے گئے ہیں:

کس شان کے چوبند ہیں کیا چاک قبا ہیں
صحرا کے بگولے تری گلیوں میں گدا ہیں
خالد احمد

میں بے بس تھا سو مڑ کے دیکھتا تھا
مری بستی کو دریا چاٹتا تھا
ندرعابد

تمھیں دیکھا تو روشنی ہوئی تھی
شوخ رنگوں سے دوستی ہوئی تھی
اکرم جاذب

بولنا مشکل نہیں تھا پر مجھے
ہے ابھی تک بے زبانی کا ملال
شہہ طراز

بے چین ہو کے چل پڑے ہم آسماں کی سمت
ہم کو تو گو نہ راس آئی زمیں کی
شفقت حیات شفق

یہ زمانہ ہے سودکاری کا
آنکھ نے خواب تک ادھارے لیے
آغا نثار

ماہنامہ بیاض کا کمال یہ ہے کہ اس کے سبب اہم شعر و ادب کے نئے زاویوں اور ذائقوں سے آگاہ ہوتے رہتے ہیں۔

فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب! آداب و تسلیمات!

ستمبر کا بیاض، قائم نقوی اور اختر شمار کی رحلت کا سوگوار ٹائٹل لیے نظر نواز ہوا۔ نقوی صاحب نے "ماہ نو" کی ادارت میں عرصہ دراز تک فروغِ شعر و ادب کی آبیاری کی۔ شمار صاحب کا ہمہ جہت ارباب قلم میں شمار ہوتا ہے۔ معروف شعر یاد آیا:

کوئی روکو ذرا دستِ اجل کو ہمارے لوگ مرتے جا رہے ہیں

بانی مدیر خالد احمد کا مرثیہ بانگ قلزم در آغوش کوزہ ہے۔ خصوصاً آخری مصرع کتنا بلیغ ہے:

پھر یہ غبار کیوں ہوا اظہار رہ گیا

"آصف ثاقب کی غزل" میں ہارون الرشید نے اس بزرگ شاعر کو عمدہ خراج انتقاد پیش کیا ہے۔ ثاقب صاحب کا ایک خوبصورت شعر:

مطالعے میں جہاں درد کا اثر آیا لہو کتاب کے اوراق پر اتر آیا

"سید فخر الدین بلے اور شہزاد احمد" کے حوالے سے ظفر معین بلے جعفری کی یاد آفرینی، تخلیقی رچاؤ کو وجدان افروز نمونہ ہے۔ شہزاد احمد بلا مبالغہ عہدِ حاضر کے عظیم شاعر ہیں۔ (مرحوم) کا ایک زندہ شعر:

فلک سروں پہ اچانک ہی آ گرا شہزاد نجومیوں نے بڑے زائچے بنائے تھے

شاعر علی شاعر کے جامع مضمون سے سعید الظفر صدیقی کے شاعرانہ مقام کا خاطر خواہ ادراک ہوتا ہے۔ موصوف کا ایک کمال شعر:

تمہارا شہر تو اب شہر ہے فرشتوں کا ہمارے پاس ہیں کچھ آدمی کہاں لے جائیں

ڈاکٹر اختر شمار کی یاد میں شاہدہ دلاور شاہ نے، دل کو چھو لینے والی تحریر قلم بند کی ہے نیز (مرحوم) ہی کے لئے، فیصل زمان چشتی کا اعتراف عظمت بھی، تحقیقی تعلق اور فنی تموج کا دلپذیر اظہاریہ ہے۔ جناب اختر شمار کے دو شاداب شعر:

یہ کون شخص مجھے کرچیوں میں بانٹ گیا یہ آئنہ تو مرا آخری ٹھکانہ تھا
اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں اس کو کھو کر تو مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں

سیدہ آمنہ ریاض نے ڈاکٹر عبد الکریم شکور کے فکر و فن کا متوازن تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس سے موصوف کے مختلف پہلو اجاگر ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک باغ و بہار شعر:

ہماری سادگی ہم کو ہی لے کے ڈوب گئی وہ ڈینٹ کھتی رہی، ہم گجور لاتے رہے

یوسف عرفان نے سلیقے سے باور کرایا ہے کہ حامد یزدانی کی "خالی ہاتھ" افسانوی بوقلمونی سے بھری ہوئی ہے اور یہ بات، یزدانی صاحب کے شعری سونے پر سہاگہ ہے۔

اعجاز رضوی نے قائم نقوی کو مختصر مگر سست نما، ہدیہ تحسین، ایصال کیا ہے۔ جناب نقوی کا ایک نمائندہ شعر:

جہاں ہم پاؤں دھرتے جا رہے ہیں وہیں سے سب گزرتے جا رہے ہیں

دیگر منظوم و منثور سلسلے بھی دل پسند اور مرغوب خاطر ہیں مگر تفصیل کی گنجائش نہیں "بیاض" کا تسلسل اور معیار، لائق دید اور قابل داد ہے۔ سلامت رہیں۔ منتخب اشعار، ایک غزل اور احترامات فراواں کے ساتھ اجازت، والسلام!

یہ شہر کے باسی ہیں کہ اڑتے ہوئے پتے	یہ شہر کے حاکم ہیں کہ جنگل کی ہوا ہیں	خالد احمد
بیٹھنے کے لئے معقول جگہ ہے کہ نہیں	تو دیکھیں کوئی میخانہ کھلا ہے کہ نہیں	انور شعور
کھلتی نہیں کسی سے بھی پیچیدگی مری	حالاں کہ ہوں میں عقدہ وا آسمان کی طرح	یعقوب پرواز
شہر میں گھومتی پھرتی ہے اجل یہ کہہ کر	بچ گیا آج اگر کوئی تو کل جائے گا	خاور اعجاز
مجھے خبر نہیں کیا چیز کھو رہا ہوں میں	بچھڑتے وقت مگر دوست رو رہا ہوں میں	قمر عباس قمر
دبا رہی ہوں تو جھ سے مسائل پہ	میں تھک گئی ہوں محبت پہ شاعری کر کے	زہرا قرار

رانا محمد شاہد

محترم مدیران عمران منظور، اعجاز رضوی
السلام علیکم!

ستمبر کا "بیاض" عہدِ حاضر کے دو لاجواب شاعروں کے سرورق کے ساتھ ملا۔ ان کی وفات کے بعد یہ یقیناً "بیاض" کی طرف سے انھیں خراجِ تحسین تھا۔ شاہد ہ وادرشاہ، فیصل زمان چشتی اور اعجاز رضوی نے اردو ادب سے محبت رکھنے والی ان شخصیات کو خوب یاد کیا۔ قائم نقوی پر اعجاز رضوی کا یہ پیرا گراف متفق کر دینے والا ہے کہ "وہ ایک ہمدرد اور مددگار شخص تھے اور اسی خوبی نے ان کو ایک اطمینان بھی عطا کیا تھا۔ اسی اطمینان نے اُن سے موت کے خوف کو دور کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انھیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تو انھوں نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا، نہ ہی احباب سے گلہ کیا کہ وہ ان سے ملنے کیوں نہیں آئے۔ بلکہ ان کا یہ کہنا تھا کہ یار سب معروف لوگ ہیں، اللہ انھیں خوش رکھے۔ قائم نقوی کو شاعر ہ بیت کرنے کا شوق نہیں تھا۔" جانے والوں کی یادیں ہی ان سے محبت کرنے والوں کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ گزشتہ دنوں معروف محقق پروفیسر جمیل احمد عدیل کو ایک اخبار میں چھپنے والا ان کا انٹرویو واٹس ایپ کیا تو کہنے لگے۔ یہ انٹرویو دیکھ کر (مرحوم) دوست اختر شمار یاد آ گئے کہ یہ انٹرویو انھوں نے کیا تھا۔ آیئے قائم نقوی اور اختر شمار کے ان خوبصورت اشعار سے انھیں یاد کرتے ہیں:

ہمارا قتل ہوا دفتروں کی کربل میں — ہم اپنے نقش فقط فائلوں میں ڈھونڈتے ہیں
بارشوں کی زد میں آ کر ڈھیر گئے کچے مکاں — اور تھوڑی دیر کو موسم سہانا ہو گیا — قائم نقوی
بعد مرنے کے میں کھلا اس پر — ایک دلچسپ انتظار تھا میں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے — تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں — اختر شمار

سلیمان عبداللہ ڈار کی تحریر "آپ کیوں روئے" پڑھی۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے گھر کا جو نقشہ کھینچا۔ اسے غور سے پڑھا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ انھوں نے لکھا:

"اس کمرہ نما گھر کی چھت یوں تو عرش بریں ہے، مگر دنیاوی نظروں کے حوالے سے اس پر کھجور کی ٹہنیاں دھری ہیں، جن میں سے جسم و جاں پر چھا جانے والی سورج کی تیز گرم کرنیں پڑتی ہیں۔" "ہمیں آج اپنے گھروں میں کیسی کیسی آسودگی میسر نہیں، مگر ہم پھر بھی صبر کرتے ہیں اور نہ ہی شکر۔ جبکہ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے گھر میں رہ کر بھی اُمت کے لیے روتے رہے یعنی انھیں اپنی راحت اور آسودگی کا خیال تک نہ آیا۔ مصنف نے لکھا کہ ایسی محبت، ایسی چاہت اور دلداری تو ماں باپ اور جگری دوست بھی نہیں کرتے۔ میرے خیال میں اس محبت کو ہم لفظوں میں بیان ہی نہیں کر سکتے۔ پروفیسر حمایت علی خان کی نعت کے یہ اشعار یاد آ گئے:

کسی غم گسار کی محنتوں کا یہ خوب میں نے صلہ دیا — کہ جو میرے غم میں گھلا رہا اسے میں نے دل سے بھلا دیا
کبھی اے عنایت کم نظر! تیرے دل میں یہ بھی کسک ہوئی؟ — جو تبسم رخِ زیست تھا اسے تیرے غم نے رلا دیا

مظہر حسین اختر کے مضمون سے پتا چلا کہ خالد احمد کی شخصیت اور فن پر ایک اور کتاب آ چکی ہے۔ یقیناً نعمان منظور کا خالد صاحب کے حوالے سے کیا گیا کام قابلِ ستائش ہے۔ ان کی وہ کتاب اب بھی یاد ہے جو خالد احمد کو لکھے خطوط پر مشتمل ہے اور جو صرف 40 دن میں مکمل کی گئی تھی۔

خورشید ربانی نے "دریاؤں کا اپنا کیا تھا" میں ادبی چوری کے حوالے سے ایک دلچسپ مضمون لکھا۔ یہ موضوع تفصیل کا متقاضی ہے۔ چنانچہ سستی شہرت کے ایسے بیوپاریوں کے حوالے سے الگ سے ایک تحریر لکھی ہے۔ اُمید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔

ہارون الرشید نے صحیح کہا کہ جیسے آواز اور خوشبو کو قید نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی منفرد فنی غزل کو بھی مرکز اور بین الاقوامی دھارے میں شامل ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ آصف ثاقب کے حوالے سے ان کے خیالات متاثر کن تھے۔ شمارے کی سب سے دلچسپ تحریر "ممتاز ادیبوں کے ذاتی خطوط" رہی۔ سلیم خارجی نے بڑے ہی منفرد انداز میں ادیبوں و شاعروں کی نفسیات کو اُجاگر کیا۔ ادب سرحدوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ شاہد ماکلی اس مرتبہ بھارت سے دو نوجوان شاعروں کے ساتھ موجود تھے۔ اب غزلوں سے کچھ پسندیدہ اشعار:

یہ ترے راز بھی اوروں پہ کرے گا افشا — راز اوروں کے تجھے آ کے بتانے والا
اُس سے اخلاص و مروت کی توقع کیسی — پھول گلدان میں کاغذ کے سجانے والا — سلطان سکون
میری کوشش یہی رہی کہ کہوں — پہلے کا جو کہا ہوا نہیں ہے — تسنیم سحر
کوئی تو ہم مقام ہمارا بھی ہے یہاں — گمنام تم بھی ہو مری پہچان کی طرح — یعقوب پرواز
سہولت دو مجھے دیوار کی تم — میں اپنے غم سنانا چاہتا ہوں — اکمل حنیف

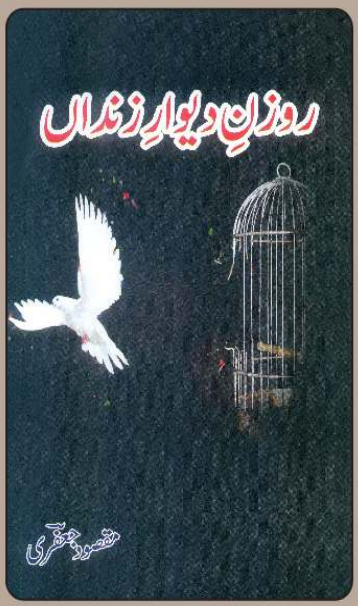
روزنِ دیوارِ زنداں
مقصود جعفری

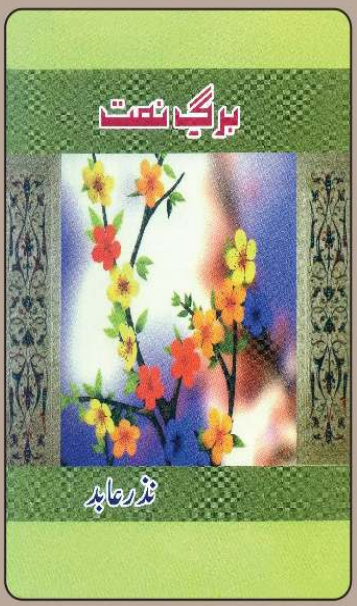
برگِ نعمت
نذر عابد

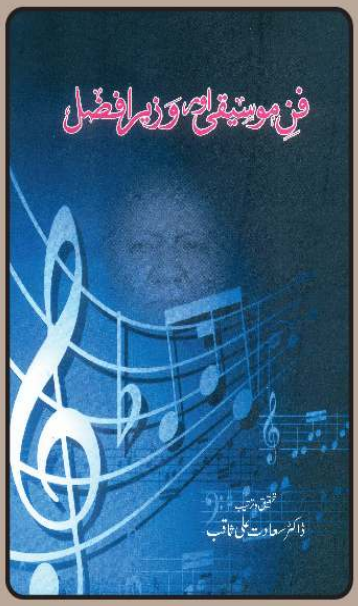
فنِ موسیقی اور دیرا فضل
مرتب
ڈاکٹر سعادت علی ثاقب

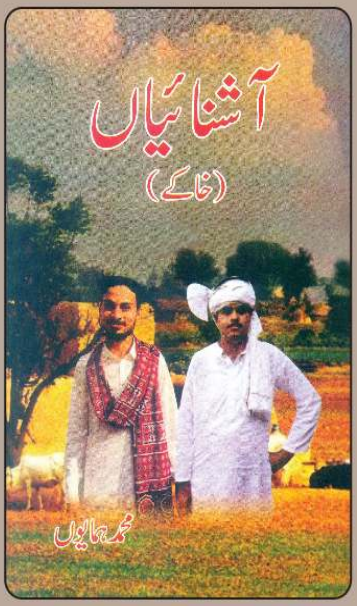
آشنائیاں
(خاکے)
محمد ہمایوں